تعلیمی نصاب 2024ء

تیسری سہ ماہی

جولائی تا ستمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن کریم

پارہ ہفتم - وَ اِذَا سَمِعُوۡا - تیسرا ربع - سُوۡرَۃُ الۡاَنۡعَام - آیات: 38 تا 74

○

وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یُّنَزِّلَ اٰیَۃً وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾

وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اُس کے ربّ کی طرف سے اس پر کوئی عظیم نشان اتارا گیا؟ تُو کہہ دے کہ یقیناً اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ کوئی عظیم نشان اتارے۔ لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡہِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿۳۹﴾

اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا جاندار نہیں اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں پر اڑتا ہے مگر یہ تمہاری ہی طرح کی اُمّتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کوئی چیز بھی نظر انداز نہیں کی۔ آخر وہ اپنے ربّ کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے۔

وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکۡمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضۡلِلۡہُ ؕ وَمَنۡ یَّشَاۡ یَجۡعَلۡہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۴۰﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ اندھیروں میں (بھٹکتے ہوئے) بہرے اور گونگے ہیں۔ جسے اللہ چاہتا ہے گمراہ ٹھہرا دیتا ہے اور جسے چاہے اسے صراطِ مستقیم پر (گامزن) کر دیتا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾
تو کہہ دے کہ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا تم پر سخت گھڑی آ جائے تو کیا اللہ کے سوا بھی تم کسی کو پکارو گے؟ اگر تم سچے ہو۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۲﴾
(نہیں) بلکہ اسی کو تم پکارو گے۔ پس وہ دور کر دے گا اگر وہ چاہے اس (مصیبت) کو جس کی طرف تم (مدد کے لئے) اُسے بلاتے ہو اور تم بھول جاؤ گے ان چیزوں کو جن کو تم شریک ٹھہراتے رہے ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾
اور یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی امتوں کی طرف (رسول) بھیجے۔ پھر ہم نے ان کو (کبھی) سختی اور (کبھی) تنگی میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی اختیار کریں۔

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۴﴾
پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی (کی مصیبت) آئی کیوں نہ انہوں نے گریہ وزاری کی۔ لیکن ان کے دل سخت ہو چکے تھے اور شیطان نے ان کو وہ اعمال خوبصورت کر کے دکھائے جو وہ کیا کرتے تھے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۵﴾
پس جب وہ اسے بھول گئے جو انہیں بشدت یاد دلایا گیا تھا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اُس پر اِترانے لگے جو اُن کو دیا گیا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا تو وہ یکدم سخت مایوس ہو گئے۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۶﴾
پس کاٹ دی گئی اس قوم کی جڑ جنہوں نے ظلم کیا تھا۔ اور سب حمد اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۷﴾
تو پوچھ کہ کیا کبھی تم نے غور کیا ہے کہ اگر اللہ تمہاری سماعت اور تمہاری بینائی لے جائے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کونسا معبود ہے جو ان (کھوئی ہوئی صلاحیتوں) کو تمہارے پاس (واپس) لے آئے۔ دیکھ کہ ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں پھر بھی وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۸﴾
تو کہہ دے کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر تمہارے پاس اللہ کا عذاب اچانک یا ظاہر و باہر (دکھائی دیتا ہوا) آ جائے تو کیا ظالم قوم کے سوا بھی کوئی ہلاک کیا جائے گا؟

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾
اور ہم پیغمبر نہیں بھیجتے مگر اس حیثیت میں کہ وہ بشارت دینے والے اور انذار کرنے والے ہوتے ہیں۔ پس جو ایمان لے آئے اور اصلاح کرے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ کوئی غم کریں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۰﴾
اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے نشانات کو جھٹلایا ان کو ضرور عذاب آ پکڑے گا بسبب اُس کے جو وہ

بدکاریاں کرتے تھے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۱

تو کہہ دے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی مَیں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ مَیں فرشتہ ہوں۔ مَیں اس کے سوا جو میری طرف وحی کی جاتی ہے کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا۔ کہہ دے کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ پس کیا تم سوچتے نہیں۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۵۲

اور اس (قرآن) کے ذریعہ تو انہیں ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ربّ کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے۔ اس (قرآن) کے سوا اُن کا کوئی ولی اور کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۳

اور تُو ان لوگوں کو نہ دھتکار جو اپنے ربّ کو اس کی رضا چاہتے ہوئے صبح بھی پکارتے ہیں اور شام کو بھی۔ تیرے ذمّہ ان کا کچھ بھی حساب نہیں اور نہ ہی تیرا کچھ حساب اُن کے ذمّہ ہے۔ پس اگر پھر بھی تو انہیں دھتکار دے گا تو تُو ظالموں میں سے ہو جائے گا۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

اور اسی طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالتے ہیں یہاں تک کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہمارے درمیان (بس) یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے۔ کیا اللہ شکر گزاروں کو سب سے زیادہ نہیں جانتا۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۵﴾

اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو (ان سے) کہا کر تم پر سلام ہو۔ (تمہارے لئے) تمہارے ربّ نے اپنے اوپر رحمت فرض کر دی ہے۔ (یعنی) یہ کہ تم میں سے جو کوئی جہالت سے بدی کا ارتکاب کرے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو (یاد رکھے کہ) وہ (یعنی اللہ) یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور اسی طرح ہم آیات کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور (یہ) اس لئے ہے کہ مجرموں کی راہ خوب کھل کر ظاہر ہو جائے۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۷﴾

تو کہہ دے کہ یقیناً مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ تو کہہ دے مَیں تو تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا (ورنہ) میں اُسی وقت گمراہ ہو جاؤں گا اور میں ہدایت

پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَکَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۸﴾

تو کہہ دے کہ میں یقیناً اپنے ربّ کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلا بیٹھے ہو۔ میرے قبضے میں وہ نہیں ہے جس کی تم جلدی کرتے ہو۔ فیصلے کا اختیار اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ حق ہی بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۹﴾

تو کہہ دے کہ اگر وہ بات جس کی تم جلدی کرتے ہو میرے ہاتھ میں ہوتی تو (اب تک) ضرور میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۶۰﴾

اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ جانتا ہے جو بر و بحر میں ہے۔ کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور کوئی دانہ نہیں زمین کے اندھیروں میں (چھپا ہوا) اور کوئی تر یا خشک چیز نہیں مگر (اس کا ذکر) ایک روشن کتاب میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور وہی ہے جو تمہیں رات کو (بصورت نیند) وفات دیتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے جو تم دن کے وقت کر چکے ہو اور

پھر وہ تمہیں اُس میں (یعنی دن کے وقت) اُٹھا دیتا ہے تا کہ (تمہاری) اجلِ مسمّٰی پوری کی جائے۔ پھر اسی کی طرف تمہارا لَوٹ کر جانا ہے۔ پھر جو بھی تم کیا کرتے تھے وہ اس سے تمہیں آگاہ کرے گا۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور وہ اپنے بندوں پر جلالی شان کے ساتھ غالب ہے اور وہ تم پر حفاظت کرنے والے (نگران) بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اُسے ہمارے رسول (فرشتے) وفات دے دیتے ہیں اور وہ کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۳﴾

پھر وہ لَوٹائے جاتے ہیں اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مولا ہے۔ خبردار! فرمانروائی اُسی کی ہے اور وہ حساب لینے والوں میں سب سے تیز ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

پوچھ کہ کون ہے جو تمہیں برّ و بحر کے اندھیروں سے نجات دیتا ہے جب تم اسے گریہ وزاری سے پکار رہے ہوتے ہو اور مخفی طور پر بھی کہ اگر اس نے ہمیں اس (آفت) سے نجات دے دی تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾

کہہ دے اللہ ہی ہے جو تمہیں اس سے بھی نجات بخشتا ہے اور ہر بے چینی سے بھی۔ پھر بھی تم شرک کرنے

لگتے ہو۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٦﴾

کہہ دے کہ وہ قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے یا تمہیں شکوک میں مبتلا کر کے گروہوں میں بانٹ دے اور تم میں سے بعض کو بعض دوسروں کی طرف سے عذاب کا مزہ چکھائے۔ دیکھ کس طرح ہم نشانات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تا کہ وہ کسی طرح سمجھ جائیں۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٧﴾ؕ

اور تیری قوم نے اس کو جھٹلا دیا ہے حالانکہ وہی حق ہے۔ تو کہہ دے کہ میں تم پر ہرگز نگران نہیں ہوں۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾

ہر پیش خبری کا ایک وقت اور جگہ مقرر ہے اور عنقریب تم جان لو گے۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾

اور جب تُو دیکھے اُن لوگوں کو جو ہماری آیات سے تمسخر کرتے ہیں تو پھر ان سے الگ ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تجھ سے اس معاملہ میں بھول چوک کروا دے تو یہ یاد آ جانے پر ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھ۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٧٠﴾

اور جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں لیکن یہ محض ایک

بڑی نصیحت ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور تُو ان لوگوں کو چھوڑ دے جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود اور نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور انہیں دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے اور تو اس (قرآن) کے ذریعہ نصیحت کرتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جان جو کچھ اس نے کمایا ہے اس کی وجہ سے ہلاک ہو جائے جبکہ اس کے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی شفاعت قبول کرنے والا۔ اور اگر وہ برابر کا بدلہ پیش بھی کر دے تب بھی اُس سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بسبب اس کے جو انہوں نے کمایا ہلاک کئے گئے۔ ان کے لئے کھولتا ہوا پانی بطور مشروب اور دردناک عذاب ہوگا بسبب اس کے جو وہ انکار کیا کرتے تھے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۲﴾

تو پوچھ کیا ہم اللہ کے سوا اُس کو پکاریں جو نہ ہمیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؟ اور کیا بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی ہے ہم ایک ایسے شخص کی طرح اپنی ایڑیوں کے بل پھرا دیئے جائیں جسے شیطانوں نے حواس باختہ کر کے زمین میں حیران و سرگردان چھوڑ دیا ہو؟ اس کے ایسے دوست ہوں جو اسے ہدایت کی طرف بلاتے ہوئے پکاریں کہ ہمارے پاس آ۔ تُو کہہ دے کہ یقیناً اللہ کی (عطا کردہ) ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ربّ العالمین کے فرماں بردار ہو جائیں۔

وَاَنۡ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوۡهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۳﴾

اور یہ (کہہ دے) کہ نماز قائم کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ وَيَوۡمَ يَقُوۡلُ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۚ قَوۡلُهُ الۡحَقُّ ؕ وَلَهُ الۡمُلۡكُ يَوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ ؕ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ ﴿۷۴﴾

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اور جس دن وہ کہتا ہے "ہو جا" تو وہ ہونے لگتا ہے اور ہو کر رہتا ہے۔ اس کا قول سچا ہے اور اسی کی بادشاہی ہوگی جس دن صُور میں پھونکا جائے گا۔ غیب کا اور حاضر کا جاننے والا ہے اور وہ صاحبِ حکمت (اور) ہمیشہ باخبر رہنے والا ہے۔

○○

حدیث

○

بہترین ذکر-الٰہی

عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اَفْضَلُ الذِّکْرِ: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ.

(ترمذی کتاب الدعوات باب دعوۃ المسلم مستجابۃ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ بہترین ذکر لا الہ الا اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) اور بہترین دعا الحمد للہ ہے (کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام تعریف کے لائق ہے)

(منتخب احادیث (اُردو)-حدیث نمبر 6-صفحہ 6-نظارت نشرواشاعت قادیان-اگست 2016ء)

○○

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام ۔ روحانی خزائن ۔ جلد 21 ۔ براہین احمدیہ ۔ حصہ پنجم ۔ صفحہ 153 / تار / 295

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم

اے یار ازل بس است روئے تو مرا — بہتر زِ ہزار خلد کوئے تو مرا
از مصلحتے دگر طرف بنم لیک — ہر لحظہ نگاہ ہست سوئے تو مرا
بر عزتِ من اگر کسے حملہ کند — صبر است طریق ہمچو خوئے تو مرا
من چیستم و چہ عزتم ہست مگر — جنگ است زِ بہر آبروئے تو مرا

ایک صاحب محمد اکرام اللہ نام نے روزانہ پیسہ اخبار مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۰۵ء میں میرے ان اشتہارات کی نسبت جن میں اوّل[1] دفعہ اور دوم[2] دفعہ کے زلزلہ کی نسبت پیشگوئیاں ہیں کچھ اعتراض شائع کئے ہیں اور میرے خیال میں وہ اعتراضات صرف تعصب کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ ناسمجھی اور نہایت محدود واقفیت بھی ان کا موجب ہے۔ قوم کی حالت پر اسی وجہ سے مجھے رونا آتا ہے کہ اعتراض کرنے کے وقت کچھ تدبّر نہیں کرتے اور جنون کی طرح ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے یا خودنمائی کی وجہ سے یہ شوق دامن گیر ہوتا ہے کہ کسی طرح معترض بن کر ہمیں بھی اوّل درجہ کے مخالفوں میں جگہ مل جائے اور یا کم سے کم لائق اور اہل علم متصور ہوں مگر بجائے لائق کہلانے کے خود اپنے ہاتھ سے اپنی پردہ دری کرتے ہیں۔ اب اہل انصاف اعتراضات کو سنیں اور ان کے جوابات پر غور کر کے دیکھیں کہ کیا ایسے اعتراضات کوئی منصف مزاج جس کو کچھ بھی عقل اور دین سے حصہ ملا ہے کر سکتا ہے۔ افسوس کہ یہ لوگ اوّل خود دھوکا کھاتے ہیں اور پھر لوگوں کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور اس جاہلیت کا سارا باعث وہ جلا ہوا تعصب ہے کہ جو جہنم کی آگ اپنے اندر رکھتا ہے۔

خلاصہ اعتراض اوّل[1] **قولہ**۔ اب ہم مرزا صاحب کے قول سے ثابت کرتے ہیں کہ زلزلہ کی پیشگوئی کوئی قابلِ وقعت چیز نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی کتاب ازالہ اوہام میں خود لکھتے ہیں کہ زلزلہ کی پیشگوئی

﴿۲﴾ قابل وقعت چیز نہیں بلکہ مہمل اور نا قابلِ التفات ہے۔ **الجواب**۔ واضح ہو کہ معترض نے اس جگہ وہ میری عبارت پیش کی ہے کہ جو میں نے انجیل متی کی ایک پیشگوئی پر جو حضرت مسیح کی طرف منسوب کی جاتی ہے ازالہ اوہام میں لکھی ہے۔ اور اس جگہ کافی ہوگا کہ وہی عبارت زلزلہ کی نسبت جو انجیل متی میں حضرت مسیح کے نام پر مندرج ہے جس کو میں نے ازالہ اوہام میں نقل کیا ہے پبلک کے سامنے پیش کر دی جائے اور پھر وہ عبارتیں جو میری پیشگوئیوں میں دونوں زلزلوں کی نسبت بذریعہ اشتہارات شائع ہو چکی ہیں بالمقابل اس جگہ لکھ دی جائیں تا ناظرین خود سمجھ لیں کہ کیا ان دونوں پیشگوئیوں کی ایک ہی صورت ہے یا ان میں کچھ فرق بھی ہے اور کیا میری پیشگوئی میں بھی زلزلہ کی نسبت صرف معمولی الفاظ ہیں جو ہر ایک زلزلہ پر صادق آسکتے ہیں جیسا کہ انجیل متی کے الفاظ ہیں یا میری پیشگوئی فوق العادت زلزلہ کی خبر دیتی ہے۔ اور اس جگہ اس بات کا ذکر کرنا بھی بے موقعہ نہ ہوگا کہ جس سرزمین میں حضرت مسیح تھے یعنی ملک شام میں اُس ملک کی قدیم سے ایسی صورت ہے کہ ہمیشہ اس میں زلزلے آیا کرتے ہیں جیسا کہ کشمیر میں اور ہمیشہ طاعون بھی اُس ملک میں آیا کرتی ہے پس اُس ملک کے لئے یہ اعجوبہ نہیں ہے کہ اُس میں زلزلہ آوے یا طاعون پیدا ہو بلکہ کوئی بڑا زلزلہ آنا بھی عجیب بات نہیں ہے حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی پہلے اس میں زلزلے آچکے ہیں اور ان کی زندگی میں بھی ہمیشہ سخت اور نرم زلزلے آتے رہے ہیں۔ پھر معمولی بات کی نسبت پیشگوئی کیا ہوگی؟ مگر ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ یہ زلزلہ جس کی پیشگوئی میں نے کی تھی اس ملک کے لئے کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ ایک انہونی اور فوق العادت بات تھی جس کو تمام ملک کے رہنے والوں نے فوق العادت قرار دیا بلکہ نمونہ قیامت سمجھا اور تمام محقق انگریزوں نے بھی یہی گواہی دی اور تاریخ پنجاب بھی یہی شہادت دیتی ہے اور نیز پرانی عمارتیں جو قریباً سولہ سو ۱۶۰۰ برس سے محفوظ چلی آئیں بزبان حال یہی شہادت دے رہی ہیں مگر سب کو معلوم ہے کہ ملک شام میں تو اِس کثرت سے زلزلے آتے ہیں کہ جب وہ پیشگوئی

حضرت مسیح کی لکھی گئی تو غالبًا اس وقت بھی کوئی زلزلہ آ رہا ہوگا۔

اب ہم ذیل میں وہ پیشگوئی لکھتے ہیں جو زلزلہ آنے کی نسبت انجیل متی میں لکھی گئی ہے جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے۔ قوم قوم پر اور بادشاہت بادشاہت پر چڑھ آوے گی اور کال اور مری پڑے گی اور جگہ جگہ بھونچال آویں گے۔ ﴿۳﴾ دیکھو انجیل متی باب ۲۴۔ یہی پیشگوئی ہے جس کی نسبت میں نے ازالہ اوہام میں وہ عبارت لکھی ہے جو معترض نے اخبار مذکور کے صفحہ پانچ کالم اوّل سطر چھبیس میں درج کی ہے اور وہ یہ ہے۔ کیا یہ بھی کچھ پیشگوئیاں ہیں کہ زلزلے آئیں گے مری پڑے گی لڑائیاں ہوں گی قحط پڑیں گے۔ معترض صاحب میری اس عبارت کو لکھ کر اس سے یہ بات نکالتے ہیں کہ گویا میں نے یہ اقرار کیا ہے کہ زلزلہ کی نسبت پیشگوئی کرنا کوئی قابل وقعت چیز نہیں اور ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اس عبارت سے میرا یہ مدّعا نہیں ہے جو معترض نے سمجھا ہے بلکہ یہ غرض ہے کہ معمولی طور پر ایک بات کو پیش کرنا جس میں کوئی اعجوبہ نہیں اور جس میں کوئی فوق العادت امر نہیں پیشگوئی کے مفہوم میں داخل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اگر کوئی پیشگوئی کرے کہ برسات کے دنوں میں کچھ نہ کچھ بارشیں ہوں گی تو یہ پیشگوئی نہیں کہلاسکتی کیونکہ عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ برسات کے مہینوں میں کچھ نہ کچھ بارشیں ہو جایا کرتی ہیں۔ ہاں اگر کوئی یہ پیشگوئی کرے کہ اب کی دفعہ برسات کے دنوں میں اس قدر بارشیں ہوں گی کہ زمین میں سے چشمے جاری ہو جائیں گے اور کوئیں پُر ہو کر نہروں کی طرح بہنے لگیں گے اور گذشتہ سو برس میں ایسی بارش کی کوئی نظیر نہیں ہوگی تو اس کا نام ضرور ایک امر خارق عادت اور پیشگوئی رکھا جائے گا سو اسی اصول کے لحاظ سے میں نے انجیل متی باب ۲۴ کی پیشگوئی پر اعتراض کیا تھا کہ صرف اتنا کہہ دینا کہ زلزلے آئیں گے خاص کر اس ملک میں جس میں ہمیشہ زلزلے آیا کرتے ہیں بلکہ سخت زلزلے بھی آتے ہیں یہ کوئی ایسی خبر نہیں ہے جس کا نام پیشگوئی رکھا جائے یا اس کو ایک امر خارق عادت ٹھہرایا جائے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ کیا اُن ہر سہ اشتہارات میں بھی جو میں نے زلزلہ کی نسبت پیشگوئی

کے طور پر ملک میں شائع کئے ایسی ہی معمولی خبر پائی جاتی ہے جس میں کوئی امر خارق عادت نہیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہی ہے تو پھر زلزلہ کی نسبت میری پیشگوئی بھی ایک معمولی بات ہوگی۔ زلزلہ کی نسبت میرے اشتہارات کے الفاظ یہ ہیں۔ یکم مئی ۱۹۰۴ء میں مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی ہوئی تھی جس کو میں نے اخبار الحکم اور البدر میں شائع کرا دیا تھا۔ **عفت الدّیار محلّها و مقامها**۔ یعنی اس ملک کا ایک حصہ مٹ جائے گا۔ اس کی وہ عمارتیں جو عارضی سکونت کی جگہ ہیں اور وہ عمارتیں جو مستقل سکونت کی جگہ ہیں دونوں نابود ہو جائیں گی ان کا نام ونشان نہیں رہے گا۔ اور **الدیار** پر جو الف لام ہے وہ دلالت کرتا ہے جو خدا تعالیٰ کے علم میں اس ملک میں سے وہ خاص خاص جگہ ہیں جن پر یہ تباہی آئے گی اور وہ خاص حصہ ملک کے مکانات ہیں جو زمین سے برابر ہو جائیں گے۔ یہ کس قدر فوق العادت پیشگوئی ہے اور کس شد و مد سے اس میں آئندہ واقعہ کا ذکر ہے جس کی سولہ سو (۱۶۰۰) برس تک بھی اس ملک میں نظیر نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ انگریزی اخباروں کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ بڑے بڑے طبقات الارض کے محقق اس ملک کی نسبت یہ فوق العادت واقعہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی شہادت سے شائع ہو چکا ہے کہ سولہ سو برس تک بھی پنجاب میں اس زلزلہ کی نظیر نہیں پائی جاتی اور تمام اخباریں اس مضمون سے بھری پڑی ہیں کہ یہ زلزلہ نمونہ قیامت تھا۔ پس جبکہ اُس وحی الٰہی میں جو میرے پر ہوئی یہ فوق العادت مضمون ہے کہ اس حادثہ سے عمارتیں نابود ہو جائیں گی اور ایک حصہ اِس ملک کا تباہ ہو جائے گا تو پھر نہایت افسوس ہے کہ ایسی عظیم الشان پیشگوئی کو جو ایک ملک کے تباہ ہونے کی خبر دیتی ہے انجیل کی ایک معمولی خبر کے برابر ٹھہرایا جائے جو زلزلے آئیں گے اور وہ بھی اُس ملک میں جو زلزلوں کا گھر ہے کیا کسی پیشگوئی کے اِس سے زیادہ الفاظ ڈرانے والے ہو سکتے ہیں۔ ہر ایک منصف مزاج خود سوچ لے کہ کیا اس ملک پنجاب کے لئے زلزلہ کی پیشگوئی کے الفاظ اس سے زیادہ فوق العادت ہو سکتے ہیں جو وحی ربّانی **عفت الدّیار محلّها و مقامها** میں پائے جاتے ہیں۔ جس کے یہ معنے ﴿۴﴾

ہیں کہ ایک حصہ ملک کا ایسا تباہ ہو جائے گا کہ اس کی عمارتیں سب نابود ہو جائیں گی نہ سرائیں باقی رہیں گی نہ مستقل سکونت کی جگہ۔ اس جگہ ادنیٰ عربی دان بھی **الدیار** کے الف لام کو ذہن میں رکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ **الدیار** سے ایک حصہ اس ملک کا مراد ہے اور **عفت** کے لفظ سے یہی مطلب ہے کہ اس حصہ ملک کے سب مکانات گر جائیں گے نابود ہو جائیں گے ناپدید ہو جائیں گے۔☆ پس کوئی مجھ کو سمجھاوے کہ اس ملک کے لئے ایسا واقعہ پہلے اس سے کب پیش آیا تھا ورنہ ایمانداری سے بعید ہے کہ انسان بے حیا ہو کر جھوٹ بولے اور اس خدا کا خوف نہ کرے جس کا ہاتھ ہر ایک وقت سزا دینے پر قادر ہے۔ اور پھر اشتہار الوصیت میں جو ۲۷ر فروری ۱۹۰۵ء میں زلزلہ سے پہلے شائع کیا گیا تھا یہ عبارت درج ہے۔ اِس وقت جو آدھی رات کے بعد چار بج چکے ہیں بطور کشف میں نے دیکھا ہے کہ دردناک موتوں سے عجیب طور پر شورِ قیامت برپا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی الہام ہوا کہ **موتا موتی لگ رہی ہے** اب سوچو کہ کیا ایک آئندہ واقعہ کی ان الفاظ سے پیشگوئی کرنا کہ وہ نمونہ قیامت ہوگا۔ اور شورِ قیامت اس سے برپا ہوگا وہ پیشگوئی اس پیشگوئی سے مساوی ہو سکتی ہے جو معمولی الفاظ میں کہا جائے جو زلزلے آویں گے۔ خاص کر شام جیسے ملک میں جو اکثر زلزلوں اور طاعون کی جگہ ہے اگر خدا تعالیٰ کا خوف ہو تو خدائے تعالیٰ کی پیشگوئی کے انکار میں اس قدر دلیری کیونکر ہو۔ یہ میرے پر حملہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ پر حملہ ہے جس کا وہ کلام ہے اور یہ کہنا کہ **عَفَتِ الدِّیار محلّھا و مقامھا** یہ لبید بن ربیعہ کے ایک بیت کا پہلا مصرعہ ہے ﴿۵﴾

☆ اگر کسی کو ان معنوں میں شک ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی قسم ہے کہ کسی مخالف عربی دان کو قسم دے کر پوچھ لے کہ کیا اس الہام **عَفَتِ الدّیار** میں عمارتوں کا گرنا۔ نابود ہو جانا اور ایسے مکانات کا گرنا جو عارضی آمد و رفت کے لئے مقرر ہوتے ہیں جیسا کہ دھرم سالہ اور کانگڑہ کے پہاڑ کی لاٹاں والی کا مندر یا دائمی بود و باش کے مکانات کا گرنا ثابت نہیں ہوتا؟ ظاہر ہے کہ ایسے کھلے طور پر ثابت ہوتا ہے جس سے آگے توضیح کی ضرورت نہیں۔ منہ

یہ بھی خدا تعالیٰ پر گستاخانہ حملہ ہے وہ ہر ایک شخص کے قول کا وارث ہے لبید ہو یا کوئی اور ہو۔ اُسی کی توفیق سے شعر بھی بنتا ہے۔ پس اگر اس نے ایک شخص کے کلام کو لے کر بطور وحی القا کر دیا تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور اگر یہ اعتراض ہوسکتا ہے تو پھر اس بات کا کیا جواب ہے کہ قرآن شریف میں جو یہ آیت ہے **فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین**۔ یہ بھی دراصل ایک انسان کا کلام تھا۔ یعنی عبداللہ بن ابی سرح کا جو ابتداء میں قرآن شریف کی بعض آیات کا کاتب بھی تھا پھر مرتد ہوگیا وہی کلام اس کا بغیر کمی بیشی کے فرقان مجید میں نازل ہوگیا اور یہ وحی الٰہی کہ **عفت الدیار محلھا و مقامھا** اس کے حروف قرآن شریف کی آیت موصوفہ کے حروف سے بھی زیادہ نہیں ہیں۔ یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ [1] سے بلکہ اس کے اکیس۲۱ حرف ہیں مگر آیت قرآنی کے بائیس۲۲ حرف۔ پھر معترض کا اس وحی الٰہی پر یہ کہاوت سنانا کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا'' ☆ اُس کو ذرا سوچنا چاہیے کہ اُس نے درحقیقت قرآن شریف پر حملہ کر کے اپنی عاقبت درست کر لی ہے۔ اور قرآن شریف میں صرف یہی وحی نہیں جو اس بات کا نمونہ ہو جو وہ پہلے انسانی کلام تھا اور پھر اُس سے خدا تعالیٰ کی وحی کا توارد ہوا بلکہ بہت سے ایسے نمونے پیش ہوسکتے ہیں جہاں انسانی کلام سے خدا تعالیٰ کے کلام کا توارد ہوا جیسا کہ قرآن شریف کو بہت جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام سے توارد ہوا ہے جس سے علماء بے خبر نہیں ہیں۔ اور جن کی ایک بڑی فہرست پیش ہوسکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معترض دراصل قرآن شریف سے منکر ہے ورنہ ایسا گستاخی اور بے ادبی کا کلمہ ہرگز اس کے منہ پر نہ آتا۔ کیا کوئی مومن ایسا اعتراض کسی پر کرسکتا ہے؟ کہ وہ اعتراض بعینہٖ قرآن شریف پر آتا ہو۔ نعوذ باللہ ہرگز نہیں۔

﴿۶﴾

☆ اگرچہ گناہ ہزاروں قسم کے ہوتے ہیں مگر نہایت درجہ کا لعنتی وہ شخص ہے جو خدا تعالیٰ کے پاک کلام پر اعتراض کرے۔ جاہل جلدی سے اور گستاخی سے اور خوش ہو کر خدا تعالیٰ کے کلام پر اعتراض کرتا ہے اور اس قدوس سے لڑتا ہے مگر وہ مرجاتا تو اس سے بہتر تھا۔ منہ

[1] المومنون: ۱۵

پھر معترض کا پیشگوئی **عفت الدیار** پر ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ **عفت** کا لفظ جو ماضی کا صیغہ ہے اس کا ترجمہ مضارع کے معنوں میں کیا گیا ہے حالانکہ اس کا ترجمہ ماضی کے معنوں میں کرنا چاہئے تھا۔ اس اعتراض کے ساتھ معترض نے بہت شوخی دکھلائی ہے۔ گویا مخالفانہ حملہ میں اس کو بھاری کامیابی ہوئی ہے۔ اب ہم اس کی کس کس دھوکا دہی کو ظاہر کریں جس شخص نے کافیہ یا ہدایت النحو بھی پڑھی ہوگی۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آ جاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جبکہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو☆ مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تا اس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو۔ اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ[1] اور جیسا کہ فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ[2]۔ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ[3] اور جیسا کہ فرماتا ہے وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ[4] اور جیسا کہ فرماتا ہے وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ﴿۷﴾ قَالُوْا نَعَمْ[5] اور جیسا کہ فرماتا ہے تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ[6] اور جیسا کہ فرماتا ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ[7] اور جیسا کہ فرماتا ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا[8]۔ اب معترض صاحب

☆ مثلاً جس شخص کو بہت سی زہر قاتل دی گئی ہو وہ کہتا ہے کہ میں تو مر گیا۔ اور ظاہر ہے کہ مر گیا ماضی کا صیغہ ہے مضارع کا صیغہ نہیں ہے۔ اس سے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا۔ اور مثلاً ایک وکیل جس کو ایک قوی اور کھلی کھلی نظیر فیصلہ چیف کورٹ کی اپنے مؤکل کے حق میں مل گئی ہے وہ خوش ہو کر کہتا ہے کہ بس اب ہم نے فتح پالی حالانکہ مقدمہ ابھی زیر تجویز ہے کوئی فیصلہ نہیں لکھا گیا۔ پس مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہم یقیناً فتح پالیں گے اسی لئے وہ مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ منہ

[1] یٰسٓ: ۵۲ [2] المآئدۃ: ۱۱۷ [3] المآئدۃ: ۱۲۰ [4] الحجر: ۴۸ [5] الاعراف: ۴۵
[6] اللّٰھب: ۲-۳ [7] الانعام: ۲۸ [8] الانعام: ۳۱

فرمادیں کہ کیا یہ قرآنی آیات ماضی کے صیغے ہیں یا مضارع کے اور اگر ماضی کے صیغے ہیں تو ان کے معنے اس جگہ مضارع کے ہیں یا ماضی کے۔ جھوٹ بولنے کی سزا تو اس قدر کافی ہے کہ آپ کا حملہ صرف میرے پر حملہ نہیں بلکہ یہ تو قرآن شریف پر بھی حملہ ہو گیا گویا وہ صرف ونحو جو آپ کو معلوم ہے خدا کو معلوم نہیں۔ اسی وجہ سے خدا نے جابجا غلطیاں کھائیں اور مضارع کی جگہ ماضی کو لکھ دیا۔

پھر اس کے ساتھ آپ کا ایک اور اعتراض بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پیشگوئی یعنی **عفت الدیار محلها و مقامها** میں زلزلہ کا لفظ کہاں ہے۔ افسوس اس معترض کو یہ معلوم نہیں کہ مقصود بالذات تو پیشگوئی کا اسی قدر مفہوم ہے جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے غرض تو صرف اتنی ہے کہ ایک حصہ ملک پر بڑی تباہی آئے گی۔ اس جگہ دانا خود سمجھ سکتا ہے کہ مکانات کا تباہ ہونا بذریعہ زلزلہ ہی ہوا کرتا ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ یہ عظیم الشان ملک کی تباہی اور شہروں اور مکانات کا نابود ہو جانا کسی اور ذریعہ سے ظہور میں آوے مگر تب بھی بہرحال یہ پیشگوئی سچی ثابت ہوگی۔ اور چونکہ سنّت اللہ کے موافق اس تباہی کو زلزلہ پر دلالتِ التزامی ہے اس لئے اس کا ذکر کرنا ضروری نہ تھا لیکن چونکہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ بعض کم فہم جن کی فطرت نادانی اور تعصب کی معجون ہے ایسا اعتراض بھی کریں گے اس لئے اُس نے زلزلہ کا لفظ بھی بتصریح لکھ دیا۔ دیکھو پرچہ الحکم مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء اور اگرچہ یہ پیشگوئی زلزلہ کی پیشگوئی سے الگ کر کے جو اس سے پہلے شائع ہو چکی ہے صرف اس قدر بتاتی ہے کہ اس ملک کے بعض حصے تباہ ہو جائیں گے اور سخت تباہی آئے گی اور عمارات نابود ہو جائیں گی اور بستیاں کالعدم ہو جائیں گی۔ اور یہ نہیں بتلاتی ﴿۸﴾ کہ کس خاص ذریعہ سے یہ تباہیاں وقوع میں آئیں گی۔ لیکن جو شخص سوچے گا کہ شہر اور بستیاں کس ذریعہ سے زمین میں دھنسا کرتی ہیں اور یک دفعہ عمارتیں کیونکر گر جاتی ہیں اور اس پیشگوئی کے ساتھ اس پیشگوئی کو بھی پڑھے گا جو اسی پرچہ میں پانچ ۵ ماہ پہلے شائع ہو چکی ہے۔

جس کے یہ لفظ ہیں کہ زلزلہ کا دھکا وہ ایسا اعتراض کرنے سے حیا کرے گا کہ پیشگوئی میں زلزلہ کا ذکر نہیں۔ ہاں ہم یہ اب بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں استعارات بھی ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ☆[1] لہٰذا ممکن تھا کہ زلزلہ سے مراد اور کوئی عظیم الشان آفت ہوتی جو پورے طور پر زلزلہ کا رنگ اپنے اندر رکھتی۔ مگر ظاہر عبارت بہ نسبت تاویل کے زیادہ حق رکھتی ہے پس دراصل اس پیشگوئی کا حلقہ وسیع تھا لیکن خدا تعالیٰ نے دشمنوں کا منہ کالا کرنے کے لئے ظاہر الفاظ کی رو سے بھی اس کو پورا کر دیا۔ اور ممکن ہے کہ بعد اس کے بعض حصے اس پیشگوئی کے کسی اور رنگ میں بھی ظاہر ہوں لیکن بہرحال وہ امر خارقِ عادت ہوگا جس کی نسبت یہ پیشگوئی ہے چنانچہ یہی زلزلہ جس نے اس قدر پنجاب میں نقصان پہنچایا اس کی نسبت تحقیقات کی رو سے سول ملٹری گزٹ وغیرہ اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اور یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ سولہ سو (۱۶۰۰) برس تک اس ملک پنجاب میں ایسا کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ پس یہ پیشگوئی بلا شبہ اوّل درجہ کی خارق عادت امر کی خبر دیتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی کچھ ایسے حوادث مختلف اسبابِ طبعیہ سے ظاہر ہوں جو ایسی تباہیوں کے موجب ہو جائیں جو خارقِ عادت ہوں پس اگر اس پیشگوئی کے کسی حصہ میں زلزلہ کا ذکر بھی نہ ہوتا تب بھی یہ عظیم الشان نشان تھا کیونکہ مقصود تو اس پیشگوئی میں ایک خارقِ عادت تباہی مکانوں اور جگہوں کی ہے جو بے مثل ہے زلزلہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے پس جب کہ یہ شہادت مل چکی کہ سولہ سو برس تک اس تباہی کی ملک پنجاب میں نظیر نہیں پائی جاتی تو یہ پیشگوئی ایک معمولی امر نہ رہا جو صرف انسانی اٹکل سے ہو سکتا ہے پھر جبکہ اس پیشگوئی کے ﴿۹﴾

☆ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا یعنی جس کو خدا کا دیدار اِس جگہ نہیں اُس جگہ بھی نہیں۔ اس آیت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ جو بیچارے جسمانی طور پر اس جہان میں اندھے ہیں وہ دوسرے جہان میں بھی اندھے ہی ہوں گے۔ پس یہ استعارہ ہے کہ جاہل کا نام اندھا رکھا گیا۔ منہ

[1] بنی اسرائیل: ۷۳

پہلے حصہ میں جو ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء میں اُسی اخبار الحکم میں درج ہوئی ہے صاف اور صریح لفظوں میں زلزلہ کا ذکر بھی شائع ہو چکا ہے تو ایسے معترض کی عقل پر ہنسیں یا رووں جو کہتا ہے جو زلزلہ کی کوئی پیشگوئی نہیں کی۔

اب یاد رہے کہ وحی الٰہی یعنی **عفت الدیار محلها و مقامها** یہ وہ کلام ہے جو آج سے تیرہ سو (۱۳۰۰) برس پہلے خدا تعالیٰ نے **لبید بن ربیعة العامری** کے دل میں ڈالا تھا جو اُس کے اس قصیدہ کا اوّل مصرع ہے جو سبعہ مُعلّقہ کا چوتھا قصیدہ ہے اور لبید نے زمانہ اسلام کا پایا تھا اور مشرف باسلام ہو گیا تھا اور صحابہ **رضی اللّٰہ عنھم** میں داخل تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کے کلام کو یہ عزّت دی کہ جو آخری زمانہ کی نسبت ایک عظیم الشان پیشگوئی تھی کہ ایسی ایسی تباہیاں ہوں گی جن سے ایک ملک تباہ ہوگا وہ اُسی کے مصرع کے الفاظ میں بطور وحی فرمائی گئی جو اس کے منہ سے نکلی تھی۔ پس یہ تعجب سخت نادانی ہے کہ ایک کلام جو مسلمان کے منہ سے نکلا ہے وہ کیوں وحی الٰہی میں داخل ہوا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں وہ کلام جو عبداللہ بن ابی سرح کے منہ سے نکلا تھا یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ وہی قرآن شریف میں نازل ہوا جس کی وجہ سے عبداللہ بن ابی سرح مرتد ہو کر مکہ کی طرف بھاگ گیا☆۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ کے کلام کا ایک مرتد کے کلام سے توارد ہوا تو اس سے کیوں تعجب کرنا چاہیے کہ لبید جیسے صحابی بزرگوار کے کلام سے اس کے کلام کا توارد ہو جائے۔ خدا تعالیٰ جیسے ہر ایک چیز کا وارث ہے ہر ایک پاک کلام کا بھی وارث ہے اور ہر ایک پاک کلام اُسی کی توفیق سے مُنہ سے نکلتا ہے۔ پس اگر ایسا کلام بطور وحی نازل ہو جائے تو اس بارے میں وہی شخص شک کرے گا جس کو اسلام میں شک ہو۔ اور لبید کے فضائل میں سے ایک یہ بھی تھا جو اس نے نہ صرف

☆ دیکھو۔ تفسیر العلامه ابی السعود علی حاشیة التفسیر الکبیر صفحہ ۲۷۶ و ۲۷۷ جلد ۶۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا بلکہ زمانہ ترقیات اسلام کا خوب دیکھا اور ۱۴ ہجری میں ایک سو ستاون[۱۵۷] برس کی عمر پا کر فوت ہوا۔ اِسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام سے بھی کئی مرتبہ قرآن شریف کا توارد ہوا جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ قال قال عمر وَافَقْتُ ﴿۱۰﴾ رَبِّیْ فِیْ اَرْبَعٍ یعنی چار باتیں جو میرے منہ سے نکلیں وہی خدا تعالیٰ نے فرمائیں اور اگر ہم اس امت مرحومہ کے اولیاء کرام کا ذکر کریں کہ کس قدر دوسروں کے کلام بطور الہام اُن کے دلوں پر القا ہوئے اور بعض کو مثنوی رومی کے اشعار بطور الہام منجانب اللہ دل پر ڈالے گئے تو یہ بیان ایک علیحدہ رسالہ کو چاہتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ جس شخص کو ایک ذرا واقفیت بھی اس کوچہ سے ہوگی وہ کبھی اس بات کو مُنہ پر نہیں لائے گا کہ خدا کے کلام کو انسان کے کلام سے توارد نہیں ہوسکتا بلکہ ہر ایک شخص جو کسی قدر علم شریعت سے حصہ رکھتا ہے وہ ایسے کلمہ کو موجبِ کفر سمجھے گا کیونکہ اس عقیدہ سے قرآن شریف سے انکار کرنا لازم آتا ہے۔ اس جگہ ایک اشکال بھی ہے اور ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس اشکال کو بھی حل کر دیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر یہ جائز ہے کہ کسی انسان کے کلام سے خدا کے کلام کا توارد ہو تو ایسا ہونا قرآن شریف کے معجزہ ہونے میں قدح پیدا کرتا ہے لیکن جیسا کہ صاحب تفسیر کبیر اور دوسرے مفسروں نے لکھا ہے کوئی جائے اشکال نہیں کیونکہ اس قدر قلیل کلام پر اعجاز کی بنا نہیں ورنہ قرآن شریف کے کلمات بھی وہی ہیں جو اور عربوں کے منہ سے نکلتے تھے اعجازی صورت کے پیدا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ خدا☆ کا کلام کم سے کم اس سورۃ کے برابر ہو جو سب سے چھوٹی سورۃ قرآن شریف میں ہے یا کم سے کم دس آیتیں ہوں کیونکہ اسی قدر کو قرآن شریف نے معجزہ ٹھہرایا ہے۔ مگر مَیں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص کا کلام خدا کے کلام میں بطور وحی کے داخل ہو جائے تو وہ بہرحال اعجاز کا رنگ پکڑ سکتا ہے۔ مثلاً یہی وحی الٰہی یعنی عَفَتِ الدّیار محلّها و مقامها جب لبید رضی اللہ عنہ کے مُنہ سے شعر کے طور پر نکلی تو یہ معجزہ نہ تھی لیکن جب وحی کے طور پر ظاہر ہوئی تو اب معجزہ ہوگئی کیونکہ

☆ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے ''انسان کا کلام'' ہونا چاہیے۔ (ناشر)

لبید ایک واقعہ گذشتہ کے حالات پیش کرتا ہے جن کا بیان کرنا انسانی قدرت کے اندر داخل ہے لیکن اب خدا تعالیٰ لبید کے کلام سے اپنی وحی کا توارد کر کے ایک واقعہ عظیمہ آئندہ کی خبر دیتا ہے جو انسانی طاقتوں سے باہر ہے پس وہی کلام جب لبید کی طرف منسوب کیا جائے تو معجزہ نہیں ہے لیکن جب خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو بلاشبہ معجزہ ہے۔ آج سے ایک سال پہلے اس بات کو کون جانتا تھا کہ ایک حصہ اس ملک کا زلزلہ شدیدہ کے سبب سے تباہ اور ویران ہو جائے گا یہ کس کو خبر تھی کہ اس قدر شہر اور دیہات یک دفعہ زمین میں دھنس کر تمام عمارتیں نابود ہو جائیں گی اور اُس زمین کی ایسی صورت ہو جائے گی کہ گویا اس میں کبھی کوئی عمارت نہ تھی پس اسی بات کا نام تو معجزہ ہے کہ کوئی ایسی بات ظہور میں آوے جو پہلے اس سے کسی کے خیال و گمان میں نہ تھی اور امکانی طور پر بھی اس کی طرف کسی کا خیال نہ تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں نے اس زلزلہ شدیدہ کو بڑے تعجب کی نظر سے دیکھا ہے اور اس کو ایک غیر معمولی اور انہونی بات اور نمونہ قیامت قرار دیا ہے اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ محققان یورپ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس ملک کی تاریخ پر سولہ سو ۱۶۰۰ برس تک نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ پہلے اس سے ایسا خوفناک اور تباہی ڈالنے والا زلزلہ اس ملک میں کبھی نہیں آیا۔ پس جس وحی نے ایک زمانہ دراز پہلے ایسے غیر معمولی واقعہ کی خبر دی کیا وہ خبر معجزہ نہیں ہے؟ کیا وہ انسانی طاقتوں کے اندر داخل ہے☆۔ جس ملک کے لوگوں نے بلکہ ان کے باپ دادوں نے ﴿۱۱﴾

☆ معترض صاحب نے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں پیسہ اخبار میں یہ اعتراض شائع کیا ہے کہ پیشگوئی **عفت الدیار محلها و مقامها** میں زلزلہ کا کہاں ذکر ہے حالانکہ زلزلہ کا ذکر اس پیشگوئی سے پانچ ۵ ماہ پہلے اُسی اخبار میں شائع ہو چکا ہے۔ اور یہ پیشگوئی اسی زلزلہ کی صفات کا بیان ہے۔ ہمارے مخالفین کی یہ دیانت اور امانت اور یہ عقل اور یہ فہم ہے۔ کیا ان لوگوں میں کوئی بھی ایسا انسان نہیں کہ خلوت میں اس شخص کو ملامت کرے اور اس کو گوشمالی کرے کہ ایسا دھوکا پبلک کو کیوں دیا حالانکہ اس کو خوب معلوم تھا کہ پرچہ الحکم ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء میں زلزلہ کی پیشگوئی صاف لفظوں میں موجود ہے جس کے ہیبت ناک نتائج الہام **عفت الدیار** میں ذکر کئے گئے ہیں اور یہ دونوں پیشگوئیاں ان کے ظہور سے ایک سال پہلے شائع کی گئی ہیں بلکہ زلزلہ کی پیشگوئی صریح اور صاف لفظوں میں **مواهب الرحمٰن** صفحہ ۸۶ میں بھی موجود ہے جس کو شائع کئے اڑھائی برس ہو چکے ہیں۔ منه

﴿۱۲﴾ بھی قریباً دو ہزار برس تک ایک واقعہ کو نہ دیکھا ہو نہ سنا ہو اور نہ اُن کے خیال و گمان میں ہو کہ ایسا واقعہ ہونے والا ہے یا امکان میں ہے پھر اگر کوئی پیشگوئی ایسے واقعہ کی خبر دے اور وہ واقعہ بعینہٖ ظہور میں آجائے تو وہ خبر نہ صرف معجزہ کہلائے گی بلکہ اوّل درجہ کا معجزہ ہوگا۔

پھر ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ معترض صاحب نے ایک عظیم الشان پیشگوئی کی عظمت دُور کرنے کے لئے اور اس کو تمام لوگوں کی نظر میں خفیف ٹھہرانے کیلئے انجیل کی اُس بے معنی پیشگوئی سے اس کو مشابہت دی ہے جس میں محض معمولی الفاظ میں لکھا ہے کہ زلزلے آویں گے۔ لیکن جو شخص ذرا آنکھ کھول کر میرے اشتہارات کی عبارت کو پڑھے گا اس کو افسوس سے کہنا پڑے گا کہ ناحق معترض نے روز روشن پر پردہ ڈالنا چاہا ہے اور ایک بھاری خیانت سے کام لیا ہے۔ اُس نے میرے اشتہارات کو پڑھ لیا ہے اور اس کو خوب علم تھا کہ میری پیشگوئی کے الفاظ جو زلزلہ کی نسبت بیان کئے گئے ہیں وہ انجیل کے الفاظ کی طرح سُست اور معمولی نہیں ہیں تاہم اس نے دانستہ ہٹ دھرمی کو اختیار کر لیا۔ کس کو معلوم نہیں کہ عربی الہام یعنی **عفت الدیار محلها و مقامها** ایک ایسی چونکا دینے والی خبر پیشگوئی کے طور پر بیان کرتا ہے جس سے بدنوں پر لرزہ پڑ جائے کیا یہ ایک معمولی بات ہے کہ شہر اور دیہات زمین میں دھنس جائیں گے اور اُردو میں تصریح کی گئی ہے کہ وہ زلزلہ کا دھکا ہوگا۔ دیکھو اخبار الحکم صفحہ ۱۵ کالم ۲ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء اور پھر ۱۹۰۱ء میں جو رسالہ آمین شائع کیا گیا تھا اس میں لکھا گیا ہے کہ وہ ایسا حادثہ ہوگا کہ اس سے قیامت یاد آجائے گی ۞ اور الحکم ۲۴ / مارچ ۱۹۰۴ء

☆ اخبار سول ملٹری گزٹ میں یہ امر تحقیقات شدہ شائع کیا گیا ہے کہ ہندوؤں کا مندر جو کانگڑہ میں زلزلہ سے نابود ہو گیا ہے دو ہزار ۲۰۰۰ برس سے یہ مندر چلا آتا تھا۔ پس اگر ایسا زلزلہ پہلے اس سے آیا ہوتا تو یہ عمارتیں پہلے سے ہی نابود ہو جاتیں۔ منہ

۞ ایسا ہی میری کتاب ''مواہب الرحمٰن'' مطبوعہ ۱۹۰۲ء میں ایک سخت زلزلہ کی خبر ہے جس سے عمارتیں گریں گی اور اس میں نہ صرف عمارتوں کے گرنے کا ذکر ہے بلکہ صاف لفظوں میں زلزلہ کا ذکر ہے۔ دیکھو مواہب الرحمٰن صفحہ ۸۶۔ منہ

میں شائع کیا گیا ہے کہ مکذّبوں کو ایک نشان دکھایا جائے گا۔ اور پھر اشتہار الانذار میں لکھا ہے کہ آنے والا زلزلہ قیامت خیز زلزلہ ہوگا۔ پھر النداء میں لکھا ہے کہ آنے والے زلزلہ سے زمین زیروزبر ہو جائے گی۔ پھر اسی میں لکھا ہے کہ یہ عظیم الشان حادثہ محشر کے حادثہ کو یاد دلائے گا۔ اور پھر اسی میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تیرے لئے زمین پر اُتروں گا تا اپنے نشان دکھلاؤں ﴿۱۳﴾ ہم تیرے لئے زلزلہ کا نشان دکھلائیں گے۔ اور وہ عمارتیں جن کو غافل انسان بناتے ہیں یا آئندہ بنائیں گے گرادیں گے اور میں وہ نشان ظاہر کروں گا جس سے زمین کانپ اٹھے گی تب وہ روز دنیا کے لئے ایک ماتم کا دن ہوگا پھر اس اشتہار میں جس کی سرخی ہے ''زلزلہ کی خبر بارسوم''۔ آنیوالے زلزلہ کی نسبت یہ عبارت لکھی ہے کہ درحقیقت یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ وہ زلزلہ اس ملک پر آنے والا ہے جو پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔ اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں گذرا۔ اب ایماناً کہو کہ انجیل میں زلزلہ کے بارے میں اس قسم کی عبارتیں کہاں ہیں اور اگر ہیں تو وہ پیش کرنی چاہئیں ورنہ خدا تعالیٰ سے خوف کر کے اس حق پوشی سے باز آنا چاہئے۔

قولہ ۔ ترجمہ میں زلزلہ کا لفظ بھی داخل کر دیا تا کہ جاہل لوگ یہ سمجھیں کہ الہام میں زلزلہ کا لفظ بھی موجود ہے۔

اقول۔ اے اندھے صاحب پیشگوئی کے مجموعی الفاظ یہ ہیں۔ زلزلہ کا دھکا **عفت الدیار محلھا و مقامھا** ۔ دیکھو اخبار الحکم ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء ان دونوں کے معنے یہ ہوئے کہ ایک زلزلہ کا دھکا لگے گا اور اس دھکا سے ایک حصہ اس ملک کا تباہ ہو جائے گا۔ اور عمارتیں گر جائیں گی اور نابود ہو جائیں گی۔ اب بتلاؤ کہ کیا ہم نے جاہلوں کو دھوکا دیا ہے☆۔

☆ جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں میری کتاب مواہب الرحمٰن میں بھی جو ۱۹۰۲ء میں چھپ کر شائع ہوگئی تھی صریح لفظوں میں یہ پیشگوئی ہے اور زلزلہ کا نام لے کر ذکر موجود ہے۔ پھر اس حالت میں جاہل تو وہ لوگ ہیں کہ جو اتنی تصریح اور توضیح کے بعد بھی سمجھتے ہیں کہ زلزلہ کا کہاں ذکر ہے ان کو چاہیے کہ آنکھیں کھول کر اخبار الحکم ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء کو پڑھیں اور رسالہ آمین

یا آپ جاہلوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور کیا ہم نے جھوٹ بولا ہے یا آپ جھوٹ بولتے ہیں؟ **لعنة اللّٰہ علی الکاذبین**. اخبار الحکم موجود ہے۔ اس کے دونوں پرچوں کو دیکھ لو اور یہ اخبار زلزلہ موعودہ سے ایک سال پہلے ملک میں شائع ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ میں بھی پہنچ چکی ہے اب بتلاؤ کس تعصب نے آپ کو اس جھوٹ پر آمادہ کیا جو آپ دعویٰ کر بیٹھے جو زلزلہ کا ذکر پیشگوئی میں موجود ہی نہیں ہے۔

قولہ۔ یہ الہام ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء☆ کے الحکم کے صفحہ کالم ۴ پر موجود ہے اور اس کے سامنے صاف طور پر جلی قلم سے لکھا ہوا ہے۔ متعلق طاعون۔

اقول۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ زلزلہ بھی طاعون کا ایک ضمیمہ ہے اور اس سے متعلق ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار فرمایا ہے کہ زلزلہ اور طاعون دونوں تیری تائید کے لئے ہیں پس زلزلہ درحقیقت طاعون سے ایک تعلق رکھتا ہے کیونکہ طاعون بھی میرے لئے خدا تعالیٰ کی ﴿۱۴﴾ طرف سے ایک نشان ہے اور ایسا ہی زلزلہ بھی۔ پس اسی وجہ سے دونوں کو باہم تعلق ہے اور دونوں ایک ہی امر کے مؤید ہیں۔ اور اگر یہ وہم دل میں پیدا ہو کہ اس فقرہ سے مراد درحقیقت طاعون ہی ہے تو یہ وہم درحقیقت فاسد ہے کیونکہ جو چیز کسی چیز سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ درحقیقت اس کا عین نہیں ہو سکتی ماسوا اس کے قرینہ قویہ اس جگہ موجود ہے کہ اس فقرہ سے مراد درحقیقت طاعون نہیں ہے یعنی جب کہ پہلے اس سے یہ الہام موجود ہے کہ زلزلہ کا دھکا تو پھر ذرہ انصاف اور عقل کو دخل دے کر خود سوچ لینا چاہیے کہ عمارتوں کا گرنا اور بستیوں کا معدوم ہونا کیا یہ طاعون کی صفات میں سے ہو سکتا ہے بلکہ یہ تو زلزلہ کی صفات میں سے ہے اس قدر مُنہ زوری ایک پرہیزگار انسان میں نہیں ہو سکتی کہ جو معنے ایک عبارت کے الفاظ سے پیدا ہو سکتے ہیں

بقیہ حاشیہ کو پڑھیں جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا اور پھر مواہب الرحمٰن کے صفحہ ۸۶ کو پڑھیں جو ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی اور پھر اپنی ایمانی حالت پر روویں۔ منہ

☆ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے'' الحکم ۳۱ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۹ کالم نمبر ۴ '' ہونا چاہیے۔ (ناشر)

اور جو اس کے سیاق اور سباق سے مترشح ہو رہے ہیں اور جو معنے واقعہ کے ظہور سے کھل گئے ہیں اور انسانی کانشنس نے قبول کر لیا ہے کہ جو کچھ ظاہر ہوا ہے وہ وہی ہے جو **عفت الدیار** کے الہام سے نکلتا ہے پھر اس کے انکار پر اصرار کرے اگر فرض بھی کر لیں کہ خود ملہم نے اپنے اجتہاد کی غلطی سے اس حادثہ کو جو **عفت الدیار** کے الہام سے ظاہر ہوتا ہے طاعون ہی سمجھ لیا تھا تو اس کی یہ غلطی کہ قبل از وقوع ہے مخالف کے لئے کوئی حجت نہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا نبی یا رسول نہیں گذرا جس نے اپنی کسی پیشگوئی میں اجتہادی غلطی نہ کی ہو تو کیا وہ پیشگوئی آپ کے نزدیک خدا تعالیٰ کا ایک نشان نہ ہوگا اگر یہی کفر دل میں ہے تو دبی زبان سے کیوں کہتے ہو پورے طور پر اسلام پر کیوں حملہ نہیں کرتے کیا کسی ایک نبی کا نام بھی لے سکتے ہو جس نے کبھی اجتہادی طور پر اپنی کسی پیشگوئی کے معنے کرنے میں غلطی نہیں کھائی۔ تو پھر بتلاؤ کہ اگر فرض بھی کر لیں کہ لفظ متعلق کے معنے بعینہٖ طاعون ہے تو کیا یہ حملہ تمام انبیاء پر نہیں۔ **عفت الدیار** کے الہامی فقرہ پر نظر ڈال کر صاف ظاہر ہے کہ اس فقرہ سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا حادثہ ہوگا کہ ایک حصہ ملک کی عمارتیں اس سے گر جائیں گی۔ اور نابود ہو جائیں گی۔ اور ظاہر ہے کہ طاعون کا عمارتوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر ایڈیٹر اخبار الحکم نے ایسا لکھ بھی دیا کہ یہ فقرہ طاعون سے متعلق ہے اور تعلّق سے وہ معنے سمجھے جائیں جو معترض نے کئے ہیں تو غایت مافی الباب یہ کہا جائے گا کہ ایڈیٹر الحکم نے ایسا لکھنے میں غلطی کی۔ اور ایسی غلطی خود انبیاء **علیہم السلام** سے پیشگوئیوں کے سمجھنے میں بعض دفعہ ہوتی رہی ہے۔ جیسا کہ **ذھب وھلی** کی حدیث بخاری میں موجود ہے اور اس کے لفظ یہ ہیں۔ **قال ابو موسیٰ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم رئیت فی المنام انّی اھاجر من مکۃ الیٰ ارض بھا نخل فذھب وھلی الیٰ انھا الیمامۃ اوھجر فاذا ھی المدینۃ یثرب** (بخاری جلد ثانی باب **ھجرۃ النّبی صلّی اللّٰہ علیہ و سلم و اصحابہ الی المدینہ**) یعنی ابوموسیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ ﴿۱۵﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے مکّہ سے ایک ایسی زمین کی طرف ہجرت کی ہے جس میں کھجوروں کے درخت ہیں۔ پس میرا خیال اِس طرف گیا کہ وہ زمین یمامہ یا زمین ہجر ہے مگر وہ مدینہ نکلا یعنی یثرب۔ اب دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی رؤیا وحی ہے اور جن کا اجتہاد سب اجتہادوں سے اسلم اور اقویٰ اور اصح ہے اپنی رؤیا کی یہ تعبیر کی تھی کہ یمامہ یا ہجر کی طرف ہجرت ہوگی۔ مگر وہ تعبیر صحیح نہ نکلی۔ پس کیا یہ پیشگوئی آپ کے نزدیک پیشگوئی نہیں ہے؟ اور کیا آپ طیار ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک حملہ کردیں۔ پس جب کہ اجتہادی غلطی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہیں تو پھر آپ کا یہ کیا ایمان ہے کہ تعصب کے جوش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی بھی کچھ پروانہیں کرتے اور خدا تعالیٰ سے کچھ شرم نہیں۔ اور پھر سچے منصف بن کر اور خدا ترسی کا دھیان رکھ کر **عفت الدیار** کے الفاظ کی طرف دیکھنا چاہیے کہ اس کے الفاظ طاعون پر صادق آتے ہیں یا زلزلہ پر۔ کیا یہ ایمانداری ہے کہ جب کہ واقعہ موعودہ کے ظہور نے **عفت الدیار** کے معنوں کو خود کھول دیا پھر بھی اس سے مراد طاعون ہی سمجھیں۔ اس پیشگوئی کے الفاظ صاف طور پر پکار رہے ہیں کہ وہ ایک حادثہ ہے جس سے عمارتیں گر جائیں گی اور ایک حصہ ملک کی بستیوں کا نابود ہو جائے گا۔ اگر آپ عربی نہیں جانتے تو کسی عربی دان سے پوچھ لیں کہ **عفت الدیار محلها و مقامها** کے کیا معنے ہیں اور اگر کسی پر اعتبار نہ ہو تو اس مصرع کے معنے جو شارح نے لکھے ہیں وہ دیکھ لیں اور وہ معنے یہ ہیں **اِنْدَرَسَتْ دِيَارُ الْاَحْبَابِ وَانْمَحٰى مَاكَانَ مِنْهَا لِلْحَوْلِ**☆ **وَمَا كَانَ لِلْاِقَامَةِ** (دیکھو معلقہ چہارم شرح مصرع اوّل) یعنی دوستوں کی بستیاں اور اُن کے گھر نابود ہو گئے اور وہ عمارتیں نابود ہو گئیں جو چند روزہ اقامت کے لئے تھیں جیسے سرائے یا قوموں کی زیارت گاہیں۔ اور وہ عمارتیں بھی نابود ہو گئیں جو مستقل سکونت کی تھیں۔ اب بتلاؤ یہ معنے طاعون پر کیونکر صادق آسکتے ہیں اور طاعون کو عمارتوں کے گرنے سے کیا تعلق ہے۔ ان معنوں میں اور خدا تعالیٰ کی وحی کے معنوں میں صرف ماضی اور

﴿۱۶﴾

☆ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے ''**لِلْحَلُوْلِ**'' ہونا چاہیے۔ (ناشر)

مضارع کا فرق ہے یعنی لبید نے اس جگہ ماضی کے معنے ملحوظ رکھے اور خدا تعالیٰ کے کلام میں اس جگہ استقبال کے معنے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ایک حصہ ملک کی عمارتیں اور بستیاں نابود ہو جائیں گی۔ نہ عارضی سکونتیں باقی رہیں گی نہ مستقل سکونتیں۔ اب بتلاؤ کہ کیا یہ معنے طاعون پر صادق آسکتے ہیں؟ اب ہٹ دھرمی کرنا کیا فائدہ۔ ناحق کی ضد دو ہی قسم کے آدمی کیا کرتے ہیں یا سخت احمق یا سخت بے ایمان اور متعصّب۔ پھر اگر آپ وہی اعتراض پیش کریں جس کا پہلے بھی جواب دیا گیا ہے یعنی یہ کہ یہ ماضی کا صیغہ ہے اور لبید رضی اللہ عنہ نے ماضی کے معنوں پر استعمال کیا ہے تو اس کا جواب پہلے بھی گذر چکا ہے کہ اب یہ کلام لبید کا نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ خدا تعالیٰ نے جابجا قرآن شریف میں عظیم الشان پیشگوئیوں کو ماضی کے لفظ سے بیان کیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ [1] ☆ اب ذرہ کچھ انصاف کو کام میں لاکر جواب دو کہ اس پیشگوئی کے الفاظ ماضی کے صیغہ میں ہیں یا مضارع کے صیغہ میں۔ عقل مند کے لئے تو یہ ایک سخت ندامت کا موقعہ ہے بلکہ ایسی غلطی مرنے کی جگہ ہو جاتی ہے جب کہ ایک شخص باوجود دعوے علم ایک بدیہی امر کا انکار کرے۔ مگر میں سمجھ نہیں سکتا کہ ان جوابات کے پرکھنے کے بعد آپ کی کیا حالت ہوگی۔ انسان کو ایسا طریق اختیار کرنے سے کیا فائدہ جس سے ایک طرف حق کو ترک کر کے خدا تعالیٰ کو ناراض کرے اور دوسری طرف ناحق پر ضد کر کے شرمندگی اور رُسوائی اُٹھاوے اور خدا تعالیٰ کی کلام میں جو اکثر پیشگوئیوں کو ماضی کے صیغہ میں بیان کیا گیا ہے اس کی اصل فلاسفی یہ ہے کہ ہر ایک واقعہ جو زمین پر ہونے والا ہے وہ پہلے ہی آسمان پر ہو چکتا ہے۔ پس آسمان کے لحاظ سے گویا وہ واقعہ ﴿۱۷﴾

☆ بائبل میں بھی بہت جگہ آئندہ واقعات کو ماضی کے صیغہ میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ یہ فقرہ بابل گر پڑا، بابل گر پڑا۔ دیکھو یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۵ ❁ اور جیسا یہ فقرہ۔ ہائے نبو پر کہ وہ ویران ہو گیا۔ قریتیم رُسوا ہوا۔ دیکھو یرمیاہ باب ۴۸۔ آیت ۱۔ منہ

[1] اللّھب: ۲، ۳ ❁ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے'' آیت ۹ ''ہونا چاہیے۔ (ناشر)

زمانہ ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔اسی بناء پر یہ امر ہے کہ عام لوگوں کو بھی جو صدہا سچی خوابیں آتی ہیں تو ان خوابوں میں بھی آئندہ ہونے والی بات کو ماضی کے طور پر بتلایا جاتا ہے۔مثلاً کسی کے گھر میں جو لڑکا پیدا ہوتا ہے تو دکھلایا جاتا ہے کہ لڑکا پیدا ہوگیا یا لڑکی پیدا ہوگئی یا ایسی چیز اس کو مل گئی جس کی تعبیر لڑکا ہے۔اور پیشگوئیوں کو ماضی کے لفظ پر لانا اور پھر مضارع کے معنوں پر استعمال کرنا نہ صرف قرآن شریف میں ہے بلکہ پہلی کتابوں میں بھی یہ محاورہ شائع متعارف ہے اور ایک بچہ بھی انکار نہیں کرسکتا۔اور حدیثوں میں بھی بکثرت یہ محاورہ موجود ہے۔**عن انس رضی اللّٰہ عنہ قال، قال النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم خربت خیبر. انا اذا نزلنا بساحۃ قوم فساء صباح المنذرین** ۔خیبر پر فتح پانے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ خیبر خراب ہوگیا اور ہم جب کسی قوم کے صحن میں اُتریں پس اس قوم کی نا مبارک صبح ہے جو ڈرائی گئی۔پس آپ نے اس جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔اور مقصود یہ تھا کہ آئندہ خراب ہوگا۔

غرض یہ ایک پیشگوئی تھی جو ماضی کے صیغہ میں کی گئی تھی اور دراصل مضارع کے معنے رکھتی تھی یعنی استقبال کے۔پس اسی طرح یہ بھی ایک پیشگوئی ہے یعنی **عفت الدیار محلھا و مقامھا** جو ماضی کے صیغہ میں ہے اور معنی استقبال کے رکھتی ہے اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں **الدیار** سے مراد ایک حصہ ملک کا ہے جیسا کہ الف لام اس پر دلالت کرتا ہے اسی وجہ سے لبید رضی اللہ عنہ نے بھی **الدیار** سے مراد عام طور پر دیار مراد نہیں لی بلکہ دیارِ احباب مراد لی ہے اور اس جگہ یعنی خدا کی کلام میں جو **عفت الدیار محلھا و مقامھا** ہے محل سے مراد ہندوؤں کی قدیم زیارت گاہیں ہیں یعنی وہ مندر ہیں جو قدیم زمانہ سے دھرم سالہ اور کانگڑہ میں موجود تھے جن کی بنیاد کا زمانہ کم سے کم سولہ سو برس ثابت ہے اور مقام سے مراد وہ عمارتیں ہیں جو دائمی سکونت کے لئے اس نواح میں بنائی گئی تھیں اور خدا تعالیٰ نے اس پیشگوئی میں یہ خبر دی تھی کہ وہ مندر یعنی بت خانے بھی گرجائیں گے جن کا گرنا اشاعت توحید ﴿۱۸﴾

کے لئے بطور ارہاص کے ہے۔اور دوسری عمارتیں بھی گر جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی وقوع میں آیا پس جب کہ ظاہر الفاظ کے رو سے پیشگوئی ظہور میں آ گئی تو اب اس سے انکار کرنا جھک مارنا ہے ظاہر الفاظ حق رکھتے ہیں کہ معنی کرنے میں اُن کی رعایت ہو اور **صَرف عن الظاھر** اس وقت سراسر حماقت ہے جب کہ ظاہری صورت میں پیشگوئی کے الفاظ پورے ہو جائیں۔ اگر یہ فقرہ انسان کا افترا ہوتا یعنی یہ فقرہ کہ **عفت الدیار محلھا و مقامھا** اور اس سے مراد طاعون ہوتی تو ایسا مفتری کبھی یہ فقرہ استعمال نہ کر سکتا کیونکہ اس کو عقل منع کرتی کہ طاعون کی نسبت وہ لفظ استعمال کرے جو طاعون پر صادق نہیں آ سکتے کیونکہ طاعون سے عمارتیں نہیں گرتیں اور اگر اجتہاد کے طور پر قبل از وقت صحیح معنے نہ کئے گئے تو اس کا نام اجتہادی غلطی ہے اور بعد از وقت جب حقیقت کھل گئی تب صحیح معنوں کو نہ ماننا اس کا نام شرارت اور بے ایمانی اور ہٹ دھرمی ہے۔

قولہ۔ ہم تو آپ سے وہ الہام پوچھتے ہیں جس میں آپ نے یہ خبر دی ہو کہ زلزلہ آئے گا لیکن ایسا الہام آپ قیامت تک پیش نہیں کر سکتے۔

اقول میں کہتا ہوں کہ جس قیامت کو آپ دُور سمجھتے تھے وہ قیامت تو آپ پر آ گئی۔ دیکھو اخبار الحکم صفحہ ۱۵ کالم نمبر ۲ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء جس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ زلزلہ کا دھکّا آئے گا اور پھر پانچ ۵ ماہ بعد ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء میں اس دھکا کی عظمت اور قوت اس وحی الٰہی میں بیان فرمائی گئی ہے یعنی یہ کہ **عفت الدیار محلھا و مقامھا** جس کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسا دھکّا ہوگا جس سے اس ملک پنجاب کی ایک حصہ کی بستیاں تباہ ہو جائیں گی۔ اور عمارتوں کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ خواہ وہ عارضی سکونتیں تھیں جیسا کہ دھرم سالہ اور کانگڑہ میں ہندوؤں کے پوجا کے مندر تھے اور خواہ مستقل سکونتیں تھیں جیسا کہ دھرم سالہ اور کانگڑہ وغیرہ کی مستقل سکونتوں کی جگہ تھیں۔ اب آپ فرمائیے کہ وہ قیامت جس کو آپ بہت دُور سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ایسا الہام تم قیامت تک پیش

﴿۱۹﴾ نہیں کر سکتے وہ قیامت آپ پر آ گئی یا نہیں؟ ہر یک سمجھ سکتا ہے کہ اُس قیامت نے ضرور آپ کو پکڑ لیا کیونکہ جس زلزلہ کی پیشگوئی سے آپ منکر ہیں اس کا صریح طور پر ذکر ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء کے اخبار الحکم کے صفحہ ۱۵ کالم نمبر ۲ میں موجود ہے۔ ذرا آنکھیں کھولو اور پڑھ لو اور کسی چپنی میں پانی ڈال کر ڈوب مرو۔ پس یہی زلزلہ مذکورہ بالا ہے جس کی صفات ظاہر کرنے کے لئے وحی الٰہی **عفت الدیار** پہلی وحی کے بعد نازل ہوئی۔ تو کیا اب تک آپ پر قیامت نہ آئی؟ اگر کہو کہ قیامت کو تو لوگ مر جائیں گے اور میں اب تک زندہ موجود ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت آپ ذلت کی موت سے مر چکے ہیں اور یہ جسمانی زندگی روحانی موت کے بعد کچھ چیز نہیں۔ کیا وہ شخص بھی زندہ کہلا سکتا ہے جس نے بڑے زور و شور سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ پیشگوئی میں ہرگز زلزلہ کا ذکر نہیں اور بڑے گھمنڈ سے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ قیامت تک تم ایسی پیشگوئی پیش نہیں کر سکتے جس میں زلزلہ کا ذکر ہو اور پھر اس کو دکھلایا گیا کہ وہ پیشگوئی موجود ہے جس میں صریح الفاظ میں زلزلہ کا ذکر ہے جو **عفت الدیار** کے الہام سے بھی پانچ ماہ پہلے الحکم میں شائع ہو چکی ہے اور الہام **عفت الدیار محلها و مقامها** اُسی زلزلہ مذکورہ کی عظمت بیان کرتا ہے کہ وہ ایسا ہوگا اس لئے اس میں دوبارہ زلزلہ کا لفظ لانے کی ضرورت نہ تھی۔

اب بتلاؤ کہ ایسی زندگی بھی کیا خاک زندگی ہے کہ ایک بات کا قیامت تک نہ ہونے کا دعویٰ کیا اور وہ بغل میں سے ہی نکل آئی۔

بمردی کہ تا زیستن مرد را — بہ از زندگانی بترکِ حیا

جہنم کزو داد فرقان خبر — بسوزد درو کاذبِ بدگہر

جو شخص اندھا اور مردہ نہ ہو سمجھ سکتا ہے کہ جس قدر اس پیشگوئی کے لئے صفائی اور قوتِ بیان چاہیے وہ سب اوّل درجہ پر اس پیشگوئی میں موجود ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اور اس سے انکار ایک ایسی ہٹ دھرمی ہے جس سے صریح سمجھا جاتا ہے کہ ایسے شخص کو خدا پر ایمان

ہی نہیں۔ اور یہ کچھ نیا طریق نہیں۔ پہلے زمانوں میں بھی وہ لوگ جن کو حق کو قبول کرنا کسی طرح منظور نہ تھا یہی طریق اختیار کرتے آئے ہیں۔

شاید آپ تعصب کے جوش سے یہ بھی اعتراض کر دیں کہ خدا تعالیٰ نے زلزلہ کے آنے کی پانچ ماہ پہلے خبر دی جو الحکم ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوئی اور پھر زلزلہ کی شدت کی نشانیاں اور اس کا ہولناک نتیجہ پانچ ماہ بعد بذریعہ اپنی وحی کے بیان کیا۔ یکجا کیوں بیان نہ کیا لیکن اگر آپ ایسا اعتراض کریں تو یہ اعتراض بھی نیا نہیں ہوگا بلکہ یہ وہی اعتراض ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے ابوجہل ملعون اور ابولہب ملعون نے قرآن شریف پر کر کے کہا تھا۔ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً[1] سو ایسا اعتراض تَشَابَهَتِ الْقُلُوب میں داخل ہوگا جس سے ایک مسلمان کو پرہیز کرنا چاہیے۔ ﴿۲۰﴾

قولہ۔ آپ نے اس الہام میں یہ بھی نہیں بتایا کہ زلزلہ سے مراد کیا ہے۔

اقول۔ ظاہر وحی الٰہی میں زلزلہ کا لفظ ہے مگر ایسا زلزلہ جو نمونہ قیامت ہوگا بلکہ قیامت کا زلزلہ ہوگا اور یہ کہ اس سے ہزارہا مکان گریں گے کئی بستیاں نابود ہو جائیں گی اور اس کی نظیر پہلے زمانہ میں نہیں پائی جائے گی۔ اور ناگہانی طور پر ہزارہا آدمی مر جائیں گے اور ایسا واقعہ ہوگا جو پہلے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہوگا۔ پس اس صورت میں مکانوں کا گرنا اور ہزاروں لوگوں کا یک دفعہ مر جانا اور ایک خارق عادت امر ظاہر ہونا اصل مقصود پیشگوئی ہے۔ اور اگرچہ ظاہر الفاظ پیشگوئی سے زلزلہ سے مراد بلاشبہ زلزلہ ہی سمجھا جاتا ہے مگر خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ ادب اسی بات کو چاہتا ہے کہ ہم اصل مقصود کو جو ایک خارق عادت امر ہے اور معجزہ ہے مدِّنظر رکھیں اور زلزلہ کی کیفیت میں دخل نہ دیں کہ وہ کس طرح کا ہوگا اور کس رنگ کا ہوگا۔ گو ظاہر الفاظ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ زلزلہ ہی ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کوئی اور آفت شدید ہو جس کی نظیر پہلے دنیا میں نہیں دیکھی گئی۔ اور زلزلہ کی کیفیت اور خاصیت اپنے اندر رکھتی ہو مثلاً

[1] الفرقان:۳۳

خسف کی صورت پر ہو اور کوئی زلزلہ محسوس نہ ہو اور زمین تہ و بالا ہو جائے یا کوئی اور خارقِ عادت آفت ظہور پذیر ہو جس کی طرف انسانی علم نے کبھی سبقت نہیں کی۔ پس بہرحال وہ معجزہ ہے۔ ہاں اگر وہ شدید آفت ظاہر نہ ہوئی جو دنیا میں ایک زلزلہ ڈال دے گی جو وحی الٰہی کے ظاہر الفاظ کی رو سے زلزلہ کے رنگ میں ہوگی یا کوئی معمولی امر ظہور میں آیا جس کو دنیا ہمیشہ دیکھتی ہے جو خارق عادت اور غیر معمولی نہیں اور جو سچ مچ قیامت کا نمونہ نہیں اور یا وہ حادثہ میری زندگی میں ظاہر نہ ہوا۔ تو بیشک نقارہ بجا کر میری تکذیب کرو اور مجھے جھوٹا سمجھو۔ غرض تو اس حادثہ عظمیٰ سے یہ ہے جو نمونہ قیامت ہوگا اور دنیا کو ایک آن میں تباہ کر جائے گا۔ اور ہزاروں انسانوں کو ہماری جماعت میں داخل کرے گا۔

﴿۲۱﴾ **قولہ** آپ نے موقع دیکھ کر براہین احمدیہ کی عبارتوں کو بھی زلزلہ پر چسپاں کیا۔ حالانکہ ان عبارتوں میں زلزلہ کا ذکر نہیں۔

اقول۔ یہ اسی طرح کا اعتراض ہے جو اس زمانہ میں متعصب پادری قرآن شریف کی اس پیشگوئی پر کرتے ہیں۔ الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ[1] اور کہتے ہیں کہ موقع دیکھ کر یہ پیشگوئی اپنی اٹکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ بنائی اور رومی سلطنت کے غلبہ کی محض اس خیال سے پیشگوئی کی کہ رومی طاقت دراصل بڑھی ہوئی تھی جنگی سامان پورے تھے۔ فوج تجربہ کار بہادر تھی اور ایرانی سلطنت کی حالت اس کے برعکس تھی اس لئے موجودہ حالات کو دیکھ کر پیشگوئی کر دی۔ پس مجھے تعجب ہے کہ پادریوں کی عادت اور خصلت کہاں سے آپ میں آ گئی۔ ظالم طبع پادری قرآن شریف کی تمام پیشگوئیوں پر یہی اعتراض کرتے ہیں جو آپ نے کیا۔ توبہ کرو ایسا نہ ہو کہ اس مشابہت سے بڑھ کر کوئی اور ترقی کر لو اور اپنے اعتراض کو ذرا آنکھ کھول کر دیکھو کہ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۵۷ میں یہ پیشگوئی ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنی چمکار دکھاؤں گا اپنی قدرت نمائی سے تجھ کو اٹھاؤں گا۔ دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی

[1] الرّوم: ۲ تا ۴

ظاہر کردے گا۔ **فلمّا تجلّٰی ربّہ للجبل جعلہ دکّا. قوۃ الرحمن لِعُبَیْدِ اللّٰہِ الصَّمد** عربی الہام کا ترجمہ یہ ہے کہ جب خدا پہاڑ پر تجلی کرے گا تو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ خدا ایسا کرے گا تا اپنے بندہ کی سچائی ظاہر کرے۔

اب سوچ کر دیکھو کہ میں نے اس میں اپنی طرف سے کیا بنایا۔ اس جگہ خدا تعالیٰ خود ایک چمکار دکھانے کا وعدہ کرتا ہے۔ جیسا کہ کوہ طور پر موسیٰ کے لئے چمکار ظاہر ہوئی اور ایک ایسی قدرت نمائی کا وعدہ کرتا ہے جو خارق عادت اور میری رفعت کا موجب ہوگی۔ اور پھر تیسری دفعہ یہ وعدہ فرماتا ہے کہ خدا بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کردے گا۔ اور پھر آخر میں اس زور آور **حملہ** اور اپنی **چمکار** اور اپنی قدرت نمائی کی شرح کرتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا ہے اور فرماتا ہے کہ خدا ایک خاص پہاڑ پر تجلی کرے گا اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اب اگر آپ کی آنکھ تعصب سے کچھ دیکھ نہیں سکتی تو کسی اور منصف مزاج سے پوچھ لو کہ اس الہامی عبارت میں کسی عظیم الشان نشان کا وعدہ دیا گیا ہے یا خاص ہماری بناوٹ ہے اور اگر وعدہ ہے تو کیا پیشگوئی کے الفاظ سے یہی نکلتا ہے کہ نشان کے طور پر پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے گا یا کچھ اور نکلتا ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ اس وقت ہمارے ذہن کا اس طرف انتقال نہ ہوا کہ درحقیقت پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا یہ ایسی ہی صورت ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن کا اس طرف انتقال نہ ہوا کہ جو ہجرت کی جگہ کشفی طور پر دکھائی گئی کہ وہ مدینہ ہے، یمامہ یا ہجر نہیں ہے۔ اور جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن کا اس طرف انتقال نہ ہوا کہ حدیبیہ والے سفر میں مکہ کے اندر نہیں جاسکیں گے اور نہ طواف خانہ کعبہ کرسکیں گے۔ پس اگر آپ کے ایسے ہی اعتراض ہیں جو اس زمانہ کے نابکار کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں پر کرتے ہیں تو مجھے تو یہ فکر پڑ گئی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کسی دن آپ اسلام سے ہی ہاتھ دھوئیں۔

﴿۲۲﴾

اب یاد رہے کہ خدا تعالیٰ نے پیشگوئی متذکرہ بالا میں جو براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۵۷ میں

موجود ہے ایک صریح اشارہ کے ساتھ زلزلہ کا ذکر کر دیا ہے کیونکہ آیت فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ[1] اس موقع کی آیت ہے جب کہ خدا تعالیٰ نے کوہِ طور پر ایک زلزلہ ڈال کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جیسا کہ یہ بیان مفصل توریت میں موجود ہے پس اس صورت میں آپ کی اس حرکت کا نام تعصب رکھیں یا نادانی رکھیں؟ جو آپ کہتے ہیں کہ ان عبارتوں میں کہیں زلزلہ کا ذکر نہیں۔ بندۂ خدا اگر زلزلہ کا ذکر نہیں تو تمہیں اس بات سے بھی انکار کرنا چاہیئے کہ کوہِ طور بھی زلزلہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

قولہ۔ عفت الدیار کے مصرع کے یہ معنے ہیں کہ زمانہ گذشتہ میں مکان برباد ہو گئے تھے۔

اقول۔ الحمدللہ! یہ تو آپ نے مان لیا کہ **عفت الدیار محلها و مقامها** کے یہی معنی ہیں کہ مکانات گر جانا اور برباد ہو جانا۔ باقی رہا یہ کہ آپ **عفت** کے لفظ کو ماضی کے معنوں تک محدود رکھتے ہیں۔ اس خیال کے رد میں ہم قرآن شریف کے نظائر پیش کر چکے ہیں بلکہ اس کے لئے تو تمام عرب کے باشندے ہمارے گواہ ہیں۔ اب بتلاؤ کیا اب بھی یہ پیشگوئی خارق عادت ہے یا نہیں اگر یہ کہو کہ اس میں کوئی وقت نہیں بتلایا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن پیشگوئیوں میں خدا تعالیٰ کو یہ منظور ہوتا ہے کہ ان کا وقت مخفی رکھا جائے اُن میں وہ ہرگز نہیں بتلاتا کہ فلاں وقت وہ پیشگوئی پوری ہوگی۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ صاف لفظوں میں فرماتا ہے کہ زلزلہ کی پیشگوئی ایسے وقت میں ظاہر ہوگی جب کہ کسی کو خبر نہیں ہوگی اور ناگہانی طور پر وہ حادثہ ظہور میں آئے گا۔ تو پھر اس حادثہ کا وقت بتلانا اپنے ہی قول کی مخالفت ہے۔ دیکھو اشتہار الندا صفحہ ۱۴۔ اور اگر کہو کہ پھر تعیّن کے بغیر پیشگوئی میں خصوصیت کیا ہوئی۔ یوں تو کبھی کبھی دنیا پر کوئی حادثہ آ جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعیّن کافی ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میری زندگی میں میری تصدیق کے لئے یہ حادثہ آئے گا اور اس وقت کے کروڑہا لوگ زندہ ہوں گے جو یہ حادثہ دیکھ لیں گے اور حادثہ ایسا ہوگا کہ اس ملک میں پہلے زمانوں میں اس کی نظیر نہیں ہوگی۔ پس یہ تعیین کافی ہے کہ وہ قیامت خیز زلزلہ میری ﴿۲۳﴾

[1] الاعراف: ۱۴۴

زندگی میں اور اکثر مخالفوں کی زندگی میں آئے گا۔ اور یاد رکھو کہ تمہاری طرح مخالفین مکہ نے بھی مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ کہہ کر وقت کی تخصیص چاہی تھی اور ان کو وقت نہیں بتلایا گیا تھا۔

قولہ۔ جو اخبار اسلامی معاملات سے ہمدردی رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اس مضمون کو اپنے جرائد میں نقل کر کے لوگوں کو آگاہ کر دیں کہ یہ اشتہار جھوٹے ہیں۔ مرزا نے کوئی پیشگوئی نہیں کی تھی۔

اقول۔ اب اس کا کیا جواب دیا جائے بجز اس کے کہ **لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین**۔ رہا یہ کہ اخبارات تکذیب کا مضمون چھاپ دیں تو اس کی اُس قادر کو کچھ پروا نہیں جس نے مجھے بھیجا ہے۔ دنیا کے کیڑے آسمانی ارادوں میں کون سا حرج ڈال سکتے ہیں۔ پہلے اس سے ابوجہل **علیہ اللعنۃ** نے عرب کی تمام قوموں کو اُکسایا تھا کہ یہ شخص (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اور جاہل لوگوں کو اپنے ساتھ جمع کر لیا تھا۔ پھر سوچو کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ کیا خدا تعالیٰ کا ارادہ اُس کی شرارتوں سے رُک گیا تھا بلکہ اس بدقسمت کا خدا تعالیٰ نے بدر کی لڑائی میں فیصلہ کر دیا اور خدا تعالیٰ کے سچے نبی کا دین تمام دنیا میں پھیل گیا۔ اِسی طرح میں سچ سچ کہتا ہوں کہ کوئی اخبار اس ارادہ کو جو آسمان پر کیا گیا ہے **روک** نہیں سکتا۔ خدا کا غضب انسان کے غضب سے بڑھ کر ہے۔ یہ میرے پر حملہ نہیں بلکہ اس خدا پر حملہ ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ وہ چاہتا ہے کہ زمین کو گناہ سے صاف کرے اور پھر اُن دنوں کو دوبارہ لاوے جو صدق اور راستبازی اور توحید کے دن ہیں۔ مگر وہ دل جو دنیا سے پیار کرتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ ایسے دن آویں۔ اے نادان کیا تو خدا سے مقابلہ کرے گا۔ کیا تیری طاقت میں ہے کہ تو اُس سے لڑائی کر سکے۔ اگر یہ کاروبار انسان کا ہوتا تو تیرے مقابلہ کی کیا حاجت تھی اس کے تباہ کرنے کے لئے خدا کافی تھا۔ مگر قریباً پچیس[۲۵] برس سے یہ سلسلہ چلا آتا ہے اور ہر روز ترقی پر ہے۔ اور خدا نے اپنے پاک **وعدوں** کے موافق اس کو فوق العادت **ترقی** دی ہے اور ضرور ہے کہ قبل اس کے جو یہ دنیا ختم ہو جائے خدا **کامل درجہ** پر اس سلسلہ کو ترقی دے خدا نے میری تصدیق کے لئے ہزارہا نشان دکھائے جن کے لاکھوں انسان گواہ ہیں ۔ زمین

﴿۲۴﴾

سے بھی **نشان** ظاہر ہوئے۔ اور آسمان سے بھی اور دوستوں میں بھی اور دشمنوں میں بھی اور کوئی مہینہ شاذ و نادر اس سے خالی جاتا ہوگا کہ کوئی نشان ظاہر نہ ہو۔ اور **اب** بھی **فوق العادت** نشان کا وعدہ ہے جس کا نام قیامت خیز زلزلہ رکھا گیا ہے جو دنیا کو وہ ہاتھ دکھائے گا جس کو کبھی دنیا نے دیکھا نہیں ہوگا۔ پس اگر خدا کا خوف ہے تو کیوں کچھ عرصہ تک صبر نہیں کیا جاتا۔ یہ زلزلہ محض اس لئے ہوگا کہ تا خدا صادق کے صدق کو ظاہر کرے اور انسانوں کو موقع دے کہ وہ **راستی** کو ایک چمکتے ہوئے نشان کے ساتھ دیکھ لیں اگرچہ اس کے بعد ایمان لانا کچھ بہت قابلِ عزت نہیں ہوگا مگر تاہم قبول کرنے والے اس رحمت سے حصہ لیں گے جو ایمان داروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

قولہ: کیا احمد بیگ کی لڑکی کا قصہ مرزائی الہامات کی رونق کو دور نہیں کرتا؟

اقول ۔اے معترض صاحب! کیا پہلے بیہودہ اعتراضات کی ندامت آپ کے لئے کچھ تھوڑی تھی کہ اس لغو اعتراض کی ندامت کا بھی آپ نے حصہ لے لیا۔ اب آپ کان کھول کر سنیئے کہ اس پیشگوئی کے دو حصہ تھے اور دونوں شرطی تھے۔ ایک حصہ شرطی طور پر ﴿۲۵﴾ احمد بیگ کی وفات کے متعلق تھا۔ یعنی اس میں یہ پیشگوئی تھی کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کی قرارداد شرطوں کا پابند نہ ہو تو تین برس پورے ہونے سے پہلے ہی فوت ہو جائے گا۔ اور نہ صرف وہی بلکہ اس کے ساتھ اور کئی موتیں اس کے اقارب کی ہوں گی۔ پس چونکہ وہ شوخی کی راہ سے کسی شرط کا پابند نہ ہو سکا اس لئے خدا نے اس کو میعاد پوری ہونے سے پہلے ہی اس جہان سے اُٹھا دیا اور کئی موتیں اور بھی ساتھ ہوئیں۔ مگر دوسرا حصہ پیشگوئی کا جو احمد بیگ کے داماد کی نسبت تھا اُس میں اس وجہ سے تاخیر ڈال دی گئی کہ باقی ماندہ لوگوں نے شرط کے مضمون سے اپنے دلوں میں خوف پیدا کیا اور بہت ڈرے اور یہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر دو شخص کی موت کی نسبت کوئی پیشگوئی ہو۔ اور ایک اُن میں سے میعاد کے اندر مر جائے تو طبعاً دوسرے کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

پس یہ تو ضروری امر تھا کہ احمد بیگ کے داماد کا گروہ احمد بیگ کی موت کو دیکھ کر اپنے دلوں میں بہت ڈرتا۔ سو خدا نے اپنے وعدہ کے موافق جب ان لوگوں کا خوف دیکھا تو داماد کی وفات کے متعلق جو پیشگوئی تھی اس میں تاخیر ڈال دی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسا کہ ڈپٹی عبداللہ آتھم اور پنڈت لیکھرام کی نسبت جو پیشگوئی وفات کی تھی اُس میں ظہور میں آیا۔ کیونکہ ڈپٹی عبداللہ آتھم نے وفات کی پیشگوئی سن کر بہت خوف ظاہر کیا اس لئے اس کی موت میں تاخیر ڈال دی گئی۔ اور مقررشدہ دنوں سے کچھ مہینے زیادہ زندہ رہا۔ لیکن لیکھرام نے پیشگوئی کو سن کر بہت شوخی ظاہر کی اور بدگوئی میں حد سے زیادہ بڑھ گیا اس لئے وہ اصلی میعاد سے بھی پہلے ہی اس جہان سے اٹھایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی پیشگوئیاں جو خدا کے رسول کرتے ہیں جن میں کسی کی موت یا اور بلا کی خبر ہوتی ہے وہ وعید کی پیشگوئیاں کہلاتی ہیں۔ اور سنت اللہ ہے کہ خواہ اُن میں کوئی شرط ہو یا نہ ہو وہ توبہ استغفار سے ٹل سکتی ہیں یا اُن میں تاخیر ڈال دی جاتی ہے جیسا کہ یونس نبی کی پیشگوئی میں وقوع میں آیا۔ اور یونس نبی نے جو اپنی قوم کے لئے چالیس دن تک عذاب آنے کا وعدہ کیا تھا وہ قطعی وعدہ تھا۔ اُس میں ایمان لانے یا ڈرنے کی کوئی شرط نہ تھی مگر باوجود اس کے جب قوم نے تضرع اور زاری اختیار کی تو خدا تعالیٰ نے اس عذاب کو ٹال دیا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کے اتفاق سے یہ تسلیم شدہ عقیدہ ہے کہ ہر ایک بلا جو خدا تعالیٰ کسی بندہ پر نازل کرنا ارادہ کرتا ہے وہ بلا صدقہ اور خیرات اور توبہ اور استغفار اور دعا سے دفع ہوسکتی ہے پس اگر وہ بلا جس کا نازل کرنا ارادہ کیا گیا ہے کسی نبی اور رسول اور مامور من اللہ کو اُس سے اطلاع دی جائے تو وہ وعید کی پیشگوئی کہلاتی ہے۔ اور چونکہ وہ بلا ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق توبہ و استغفار اور صدقہ خیرات اور دعا و تضرّع سے دفع ہوسکتی ہے یا اس میں تاخیر پڑسکتی ہے۔ اور اگر وہ بلا جو پیشگوئی کے رنگ میں ظاہر کی گئی ہے صدقہ خیرات وغیرہ سے دور نہ ہوسکے ﴿۲۶﴾

تو خدا تعالیٰ کی تمام کتابیں اس سے باطل ٹھہریں گی۔ اور تمام نظام دین کا اس سے درہم برہم ہو جائے گا۔ معترض نے اسلام پر یہ سخت حملہ کیا ہے اور نہ صرف اسلام پر بلکہ تمام نبیوں پر یہ حملہ ہے اور اگر عمدًا یہ حملہ نہیں کیا تو اسلام اور شریعت سے سخت ناواقفیت اُس کی ثابت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں سے ایمانداروں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ میرے پر حملہ کرنے سے ان کا ارادہ صرف میرے پر حملہ نہیں ہے بلکہ دین اسلام کی اُن کو کچھ پروا نہیں اور اسلام کے وہ چھپے دشمن ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنے دین کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔

اس ناسمجھ کو یہ بھی تو خبر نہیں کہ جیسے خدا تعالیٰ نے اپنے اخلاق میں یہ داخل رکھا ہے کہ وہ وعید کی پیشگوئی کو توبہ و استغفار اور دعا اور صدقہ سے ٹال دیتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اُس نے یہی اخلاق سکھائے ہیں جیسا کہ قرآن شریف اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت جو منافقین نے محض خباثت سے خلاف واقعہ تہمت لگائی تھی اس تذکرہ میں بعض سادہ لوح صحابہ بھی شریک ہو گئے تھے۔ ایک صحابی ایسے تھے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر سے دو وقتہ روٹی کھاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی اس خطا پر قسم کھائی تھی اور وعید کے طور پر عہد کر لیا تھا کہ میں اس بے جا حرکت کی سزا میں اس کو کبھی روٹی نہ دوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ [1] تب حضرت ابوبکر نے اپنے اس عہد کو توڑ دیا اور بدستور روٹی لگا دی۔ اسی بنا پر اسلامی اخلاق میں یہ داخل ہے کہ اگر وعید کے طور پر کوئی عہد کیا جائے تو اُس کا توڑنا حسن اخلاق میں داخل ہے۔ مثلاً اگر کوئی اپنے خدمتگار کی نسبت قسم کھائے کہ میں اس کو ضرور پچاس ۵۰ جوتے ماروں گا تو اس کی توبہ اور تضرع پر معاف کرنا سنت اسلام ہے تا تخلق با خلاق اللّٰہ ہو جائے مگر وعدہ کا تخلف جائز نہیں ترکِ وعدہ پر باز پُرس ہو گی مگر ترکِ وعید پر نہیں۔

﴿۲۷﴾

قولہ: اور پیشگوئیوں کا حال اس سے بھی زیادہ ابتر ہے۔

[1] النّور: ۲۳

اقول ۔اے متعصب نادان! تجھے کب اتفاق ہوا ہے کہ تو میری پیشگوئیوں کو غور سے دیکھتا اور اُن سب پر اطلاع پاتا۔اور تجھے کب اتفاق ہوا کہ میری صحبت میں رہتا اور میرے نشانوں کو بچشم خود دیکھتا۔ میں تجھے کس سے مشابہت دوں۔تو اُس اندھے سے مشابہ ہے جو سورج کے وجود سے انکار کرتا ہے اور اپنی نابینائی کی طرف نہیں دیکھتا۔ ہر ایک واقف حال سمجھ سکتا ہے کہ کیا میری پیشگوئیوں کا حال ابتر ہے یا تیرے ایمان کا ہی حال ابتر ہے۔عقلمندوں کے لئے تیرے اعتراضات کا یہی نمونہ کافی ہے کہ جو بات تمام انبیاء کے نزدیک مسلّم ہے اور تمام فرقہ ہائے اسلام کے نزدیک مسلّم ہے وہی بات تیرے نزدیک جائے اعتراض ہے۔ ہائے افسوس کیا یہی لوگ اسلام کے **لیڈر** بننا چاہتے ہیں جن کو خدا کی تعلیم اور اسلام کے عقیدہ کی بھی خبر نہیں اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیْہ راجِعُوْن۔

اے ظالم معترض کیا اسی سرمایہ پر قلم اٹھایا تھا؟ گو تعصب کا جوش تھا مگر اپنی جہالت کو دکھلانا کیا ضرور تھا۔ ہر ایک بات سراسر جھوٹ ہر ایک شبہ محض شیطانی وسوسہ۔اس علم اور واقفیت کے ساتھ تیرے دل میں کیوں گدگدی اُٹھی کہ خدا تعالیٰ کی پاک وحی پر اعتراض کرے اگر تم خاموش رہتے تو بہتر تھا۔ناحق گناہ خریدا اور زبان کے ذریعہ سے اپنی پوشیدہ نادانی پر سب کو مطلع کر دیا اور پبلک میں اپنی رُسوائی کرائی اور اپنی حالت پر شیخ **سعدی** علیہ الرحمۃ کی وہ مثل صادق کر لی جو بوستان میں ہے اور وہ یہ ہے:-

یکے نیک خلق و خَلَق پوش بود — کہ در مصر یک چند خاموش بود
جہانے برو بود از صدق جمع — چو پروانہ ہا وقتِ شب گرد شمع
شبے در دِل خویش اندیشہ کرد — کہ پوشیدہ زیر زبان است مَرد ﴿۲۸﴾
اگر ماند فطنت نہان در سرم — چہ دانند مردم کہ دانش وَرم
سخن گفت و دشمن بدانست و دوست — کہ درمصر ناداں تر از وے ہموست

حضورش پریشاں شد و کارزشت سفر کرد و بر طاقِ مسجد نوشت
در آئینہ گر روئے خود دیدمے بہ بیدانشی پردہ ندریدمے

اب میں محمد اکرام اللہ خان صاحب شاہجہان پوری کے ان اعتراضات کا جواب لکھ چکا جو **روزانہ پیسہ اخبار** مؤرخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۵ء کے صفحہ ۵ میں چھپے ہیں۔ لیکن بعد اس کے میرے دوست مولوی **عبدالکریم** صاحب کے نام ایک صاحب نے جنہوں نے اپنا نام اپنے خط میں ظاہر نہیں کیا ایک خط بھیجا ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کا واسطہ ڈال کر چند اعتراضات کا جواب مانگا ہے جو انہیں پیشگوئیوں کے متعلق ہیں۔ اگرچہ ان اعتراضات کا جواب کافی طور پر اسی حصہ براہین میں آچکا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کا واسطہ دے کر معترض صاحب کی درخواست ہے اس لئے ہم تکرار کلام کی کچھ پروا نہ رکھ کر محض لِلّٰہ صاحب موصوف کے اعتراضات کا جواب برعایت اختصار ذیل میں دیتے ہیں۔

قولہ: عفت الدیار محلّها و مقامها کا فقرہ جسے جناب مقدس مرزا صاحب اپنا الہام و وحی فرما رہے ہیں ایک پرانے شاعر کا مصرع ہے۔ کیا کسی نبی کو کبھی ایسی وحی ہوئی جس کے الفاظ حرفاً حرفاً وہی ہوں جو اس نبی سے پہلے کسی آدمی کی زبان سے نکل چکے ہوں۔ اگر آپ یہ ثابت کرسکیں تو دوسرا اعتراض یہ ہوگا کہ اس صورت میں خدا کے قول اور بندہ کے قول میں فرق کیا ہوگا۔

اقول ۔اس بارہ میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ اور نبیوں کو تلاش کرنا کچھ ضروری نہیں خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض ایسے فقرے وحی الٰہی کے نازل ہو چکے ہیں جو پہلے وہ کسی آدمی کے منہ سے نکلے تھے۔ جیسا کہ یہ فقرہ وحی فرقانی یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[1] ۔یہ فقرہ پہلے عبداللہ بن ابی سرح کی زبان سے نکلا تھا۔ اور وہی فقرہ وحی قرآنی میں نازل ہوا۔ دیکھو تفسیر کبیر الجزء السادس صفحہ ۲۷۶ مطبوعہ مصر۔ اصل عبارت یہ ہے۔ روی الکلبی عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما. ﴿۲۹﴾

[1] المؤمنون: ۱۵

ان عبداللّٰہ بن سعد بن ابی سرح کان یکتب ھذہ الاٰیات لرسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فلما انتھی الٰی قولہ تعالٰی خلقًا اٰخر عجب من ذالک فقال فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین . فقال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اُکتب فھٰکذا نزلت، فشکّ عبد اللّٰہ وقال ان کان محمد صادقًا فیما یقول فانہ یوحٰی اِلیَّ کما یوحٰی الیہ وان کان کاذبًا فلا خیر فی دینہ فھرب الٰی مکّۃ فقیل انہ مات علی الکفر وقیل انہ اسلم یوم الفتح ۔ترجمہ یہ ہے کہ کلبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ ابن ابی سرح قرآن شریف کی آیات لکھا کرتا تھا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روبرو جیسی آیت نازل ہوتی تھی اُس سے لکھواتے تھے۔ پس جب وہ آیت لکھوائی گئی جو خلقاً اٰخر تک ختم ہوتی ہے تو عبداللہ اس آیت سے تعجب میں پڑ گیا۔ اور عبداللہ نے کہا فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی لکھ لے کیونکہ خدا نے بھی یہی فقرہ جو تیرے منہ سے نکلا ہے یعنی فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین نازل کر دیا ہے۔ پس عبداللہ شک میں پڑ گیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو میری زبان کا کلمہ ہے وہی خدا کا کلمہ ہوگیا۔ اور اُس نے کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوے میں صادق ہے تو مجھے بھی وہی وحی ہوتی ہے جو اُسے ہوتی ہے اور اگر کاذب ہے تو اس کے دین میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پھر وہ مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ پس ایک روایت یہ ہے کہ وہ کفر پر مر گیا اور ایک یہ بھی روایت ہے کہ وہ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوگیا۔

اب دیکھو عبداللہ ابن ابی سرح کے کلام سے خدا تعالیٰ کے کلام کا توارد ہوا یعنی عبداللہ کے مُنہ سے بھی یہ فقرہ نکلا تھا فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین اور خدا تعالیٰ کی وحی میں بھی یہی آیا۔ اور اگر کہو کہ پھر خدا تعالیٰ کے کلام اور انسان کے کلام میں ما بہ الامتیاز کیا ہوا؟ تو اوّل تو ہم اس کا یہی جواب دیتے ہیں کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آپ قرآن شریف میں فرمایا ہے

﴿۳۰﴾ مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کلام جو غیر کا کلام کہلاتا ہے قرآنی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو کیونکہ اعجاز کیلئے اسی قدر معتبر سمجھا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ[1] یہ نہیں فرمایا کہ فَاْتُوْا بِآيَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یا فَاْتُوْا بِكَلِمَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ اور درحقیقت یہ سچ ہے کہ خدا کے کلمات علیحدہ علیحدہ تو وہی کلمات ہیں جو کفار کی زبان پر بھی جاری تھے۔ پھر رنگینی عبارت اور نظم کلام اور دیگر لوازم کے لحاظ سے وہی کلمات بحیثیت مجموعی ایک معجزہ کے رنگ میں ہو گئے اور جو معجزہ خدا تعالیٰ کے افعال میں پایا جاتا ہے اس کی بھی یہی شان ہے یعنی وہ بھی اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے جیسا کہ کلام اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے منہ سے جو چھوٹے چھوٹے فقرے نکلتے ہیں وہ اپنے مطالب عالیہ کے لحاظ سے جو اُن کے اندر ہوتے ہیں انسانی فقرات سے امتیاز کلّی رکھتے ہیں۔ یہ امر دیگر ہے کہ انسان ان کے پوشیدہ حقائق معارف تک نہ پہنچے مگر ضرور ان کے اندر انوارِ مخفیہ ہوتے ہیں جو ان کلمات کی رُوح ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہی کلمہ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[2] اپنی گذشتہ آیات کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایک امتیازی رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یعنی اس قسم کی روحانی فلاسفی اس کے اندر بھری ہوئی ہے کہ وہ بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کی نظیر انسانی کلام میں نہیں ملتی۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ کے ابتدا میں جو سورۃ المؤمنون ہے جس میں یہ آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ہے اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ کیونکر انسان مراتب ستّہ کو طے کر کے جو اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں اپنے کمال روحانی اور جسمانی کو پہنچتا ہے۔ سو خدا نے دونوں قسم کی ترقیات کو چھ چھ مرتبہ پر تقسیم کیا ہے اور مرتبہ ششم کو کمال ترقی کا مرتبہ قرار دیا ہے اور یہ مطابقت روحانی اور جسمانی وجود کی ترقیات کی ایسے خارقِ عادت طور پر دکھلائی ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے کبھی کسی انسان کے ذہن نے اس نکتہ معرفت کی طرف سبقت نہیں کی۔ اور اگر کوئی دعوے کرے کہ سبقت کی ہے تو

[1] البقرۃ:۲۴ [2] المؤمنون:۱۵

یہ بار ثبوت اُس کی گردن پر ہوگا کہ یہ پاک فلاسفی کسی انسان کی کتاب میں سے دکھلاوے اور یہ یاد رہے کہ وہ ایسا ہرگز ثابت نہیں کر سکے گا۔ پس بدیہی طور پر یہ معجزہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے وہ عمیق مناسبت جو روحانی اور جسمانی وجود کی اُن ترقیات میں ہے جو وجود کامل کے مرتبہ تک پیش آتی ہیں ان آیات مبارکہ میں ظاہر کر دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ظاہری اور باطنی صنعت ایک ہی ہاتھ سے ظہور پذیر ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ ﴿۳۱﴾

بعض نادانوں نے یہ بھی اعتراض کیا تھا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے نطفہ کی حالت سے لے کر اخیر تک جسمانی وجود کا قرآن شریف میں نقشہ کھینچا ہے یہ نقشہ اس زمانہ کی جدید تحقیقات طبی کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ لیکن اُن کی حماقت ہے کہ ان آیات کے معنی انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ گویا خدا تعالیٰ رحم کے اندر انسانی وجود کو اس طرح بناتا ہے کہ پہلے بکلّی ایک عضو سے فراغت کر لیتا ہے پھر دوسرا بناتا ہے۔ یہ آیات الٰہیہ کا منشا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے بچشم خود ملاحظہ کر لیا ہے اور مُضغہ سے لے کر ہر ایک حالت کے بچے کو دیکھ لیا ہے۔ خالق حقیقی رحم کے اندر تمام اعضاء اندرونی و بیرونی کو ایک ہی زمانہ میں بناتا ہے یعنی ایک ہی وقت میں سب بنتے ہیں تاخیر تقدیم نہیں۔ البتہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تمام وجود انسان کا ایک جما ہوا خون ہوتا ہے اور پھر سارے کا سارا ایک ہی وقت میں مُضغہ بن جاتا ہے اور پھر ایک ہی وقت میں کچھ حصہ اس کا اپنے اپنے موقعہ پر ہڈیاں بن جاتا ہے اور پھر ایک ہی وقت میں اس تمام مجموعہ پر ایک زائد گوشت چڑھ جاتا ہے جو تمام بدن کی کھال کہلاتی ہے جس سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس مرتبہ پر جسمانی بناوٹ تمام ہو جاتی ہے اور پھر جان پڑ جاتی ہے۔ یہ وہ تمام حالتیں ہیں جو ہم نے بچشم خود دیکھ لی ہیں۔

اب ہم روحانی مراتب ستّہ کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (۱) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۲) وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۳) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ [1]

[1] المؤمنون: ۲ تا ۵

(۴)وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۵)وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ(۶) وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[1] اور ان کے مقابل جسمانی ترقیات کے مراتب بھی چھ قرار دیئے ہیں جیسا کہ وہ ﴿۳۲﴾
ان آیات کے بعد فرماتا ہے:۔(۱) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ(۲) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً(۳) فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً (۴)فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۵)فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا(۶) ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[2]

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ظاہر ہے کہ پہلا مرتبہ روحانی ترقی کا یہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ یعنی وہ مومن نجات پا گئے جو اپنی نماز اور یاد الٰہی میں خشوع اور فروتنی اختیار کرتے ہیں اور رقّت اور گدازش سے ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔اس کے مقابل پر پہلا مرتبہ جسمانی نشوونما کا جو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے یعنی ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ یعنی پھر ہم نے انسان کو نطفہ بنایا اور وہ نطفہ ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔سو خدا تعالیٰ نے آدم کی پیدائش کے بعد پہلا مرتبہ انسانی وجود کا جسمانی رنگ میں نطفہ کو قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ نطفہ ایک ایسا تخم ہے جو اجمالی طور پر مجموعہ ان تمام قویٰ اور صفات اور اعضاء اندرونی اور بیرونی اور تمام نقش و نگار کا ہوتا ہے جو پانچویں درجہ پر مفصل طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور چھٹے درجہ پر اتم اور اکمل طور پر اُن کا ظہور☆ ہوتا ہے اور با ایں ہمہ نطفہ باقی تمام درجات سے زیادہ تر معرضِ خطر میں ہے۔کیونکہ ابھی

☆ درجات سے مراد وہ درجے ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں۔پانچواں درجہ وہ ہے جب قدرت صانع مطلق سے انسانی قالب تمام و کمال رحم میں تیار ہو جاتا ہے۔اور ہڈیوں پر ایک خوشنما گوشت چڑھ جاتا ہے۔اور چھٹا درجہ وہ ہے جب اس قالب میں جان پڑ جاتی ہے۔اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے انسان کے روحانی وجود کا پہلا مرتبہ حالتِ خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز ہے اور درحقیقت وہ بھی اجمالی طور پر مجموعہ اُن تمام امور کا ہے جو بعد میں کھلے طور پر انسان کے روحانی وجود میں نمایاں ہوتے ہیں۔ منہ

[1] المؤمنون:۶ تا ۱۰ [2] المؤمنون:۱۴، ۱۵

وہ اُس تخم کی طرح ہے جس نے ہنوز زمین سے کوئی تعلق نہیں پکڑا۔ اور ابھی وہ رحم کی کشش سے بہرہ ور نہیں ہوا ممکن ہے کہ وہ اندام نہانی میں پڑ کر ضائع ہو جائے جیسا کہ تخم بعض اوقات پتھریلی زمین پر پڑ کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ نطفہ بذاتہا ناقص ہو یعنی اپنے اندر ہی کچھ نقص رکھتا ہو اور قابل نشو ونما نہ ہو۔ اور یہ استعداد اُس میں نہ ہو کہ رحم اس کو اپنی طرف جذب کر لے اور صرف ایک مُردہ کی طرح ہو جس میں کچھ حرکت نہ ہو۔ جیسا کہ ایک بوسیدہ تخم زمین ﴿۳۳﴾
میں بویا جائے۔ اور گو زمین عمدہ ہو مگر تاہم تخم بوجہ اپنے ذاتی نقص کے قابلِ نشو ونما نہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ بعض اور عوارض کی وجہ سے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں نطفہ رحم میں تعلق پذیر نہ ہو سکے اور رحم اس کو اپنی کشش سے محروم رکھے۔ جیسا کہ تخم بعض اوقات پیروں کے نیچے کچلا جاتا ہے یا پرندے اس کو چُگ جاتے ہیں یا کسی اور حادثہ سے تلف ہو جاتا ہے۔

یہی صفات مومن کے روحانی وجود کے اوّل مرتبہ کے ہیں اور اوّل مرتبہ مومن کے روحانی وجود کا وہ خشوع اور رقت اور سوز و گداز کی حالت ہے جو نماز اور یادِ الٰہی میں مومن کو میسر آتی ہے یعنی گدازش اور رقت اور فروتنی اور عجز و نیاز اور روح کا انکسار اور ایک تڑپ اور قلق اور تپش اپنے اندر پیدا کرنا۔ اور ایک خوف کی حالت اپنے پر وارد کر کے خدائے عزّ وجلّ کی طرف دل کو جھکانا جیسا کہ اِس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔ یعنی وہ مومن مراد پا گئے جو اپنی نماز میں اور ہر ایک طور کی یادِ الٰہی میں فروتنی اور عجز و نیاز اختیار کرتے ہیں اور رقت اور سوز و گداز اور قلق اور کرب اور دلی جوش سے اپنے ربّ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ خشوع کی حالت جس کی تعریف کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے روحانی وجود کی طیاری کے لئے پہلا مرتبہ ہے یا یوں کہو کہ وہ پہلا تخم ہے جو عبودیت کی زمین میں بویا جاتا ہے اور وہ اجمالی طور پر ان تمام قویٰ اور صفات اور اعضاء اور تمام نقش و نگار اور حسن و جمال اور خط و خال اور شمائل روحانیہ پر مشتمل ہے۔

جو پانچویں اور چھٹے درجہ میں انسانِ کامل کیلئے نمودار طور پر ظاہر ہوتے اور اپنے دلکش پیرایہ میں تجلی فرماتے ہیں☆ اور چونکہ وہ نطفہ کی طرح روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے اس لئے وہ آیت قرآنی میں نطفہ کی طرح پہلے مرتبہ پر رکھا گیا ہے اور نطفہ کے مقابل پر دکھلایا گیا ہے تا وہ لوگ جو ﴿۳۴﴾
قرآن شریف میں غور کرتے ہیں سمجھ لیں کہ نماز میں خشوع کی حالت روحانی وجود کے لئے ایک نطفہ ہے اور نطفہ کی طرح روحانی طور پر انسان کامل کے تمام قویٰ اور صفات اور تمام نقش و نگار اس میں مخفی ہیں۔ اور جیسا کہ نطفہ اُس وقت تک معرضِ خطر میں ہے جب تک کہ رحم سے تعلق نہ پکڑے۔ ایسا ہی روحانی وجود کی یہ ابتدائی حالت یعنی خشوع کی حالت اُس وقت تک خطرہ سے خالی نہیں جب تک کہ رحیم خدا سے تعلق نہ پکڑ لے۔ یاد رہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فیضان بغیر توسط کسی عمل کے ہو تو وہ رحمانیت کی صفت سے ہوتا ہے جیسا کہ جو کچھ خدا نے زمین و آسمان وغیرہ انسان کے لئے بنائے یا خود انسان کو بنایا یہ سب فیضِ رحمانیت سے ظہور میں آیا لیکن جب کوئی فیض کسی عمل اور عبادت اور مجاہدہ اور ریاضت کے عوض میں ہو وہ رحیمیت کا فیض کہلاتا ہے۔ یہی سنت اللہ بنی آدم کے لئے جاری ہے پس جب کہ انسان نماز اور یادِ الٰہی میں خشوع کی حالت اختیار کرتا ہے تب اپنے تئیں رحیمیت کے فیضان کے لئے مستعد بناتا ہے۔ سو نطفہ میں اور روحانی وجود کے پہلے مرتبہ میں جو حالت خشوع ہے صرف فرق یہ ہے کہ نطفہ رحم کی کشش کا محتاج ہوتا ہے اور یہ رحیم کی کشش کی طرف احتیاج رکھتا ہے اور جیسا کہ نطفہ کے لئے ممکن ہے کہ وہ رحم کی کشش سے پہلے ہی ضائع ہو جائے۔

☆ پانچواں درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[1]۔ اور چھٹا درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[2]۔ اور یہ پانچواں درجہ جسمانی درجات کے پنجم درجہ کے مقابل پر ہوتا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے یعنی فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا[3] اور چھٹا درجہ جسمانی درجات کے ششم درجہ کے مقابل پر پڑا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[4]۔ منہ

[1] المؤمنون:۹ [2] المؤمنون:۱۰ [3]، [4] المؤمنون:۱۵

ایسا ہی رُوحانی وجود کے پہلے مرتبہ کے لئے یعنی حالت خشوع کے لئے ممکن ہے کہ وہ رحیم کی کشش اور تعلق سے پہلے ہی برباد ہو جائے۔ جیسا کہ بہت سے لوگ ابتدائی حالت میں اپنی نمازوں میں روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور خدا کی محبت میں طرح طرح کی دیوانگی ظاہر کرتے ہیں اور طرح طرح کی عاشقانہ حالت دکھلاتے ہیں اور چونکہ اس ذات ذوالفضل سے جس کا نام رحیم ہے کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا اور نہ اُس کی خاص تجلی کے جذبہ سے اُس کی طرف کھنچے جاتے ہیں اس لئے ان کا وہ تمام سوز و گداز اور تمام وہ حالتِ خشوع بے بنیاد ہوتی ہے اور بسا اوقات ان کا قدم پھسل جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی حالت سے بھی بدتر حالت میں جا پڑتے ہیں۔ پس یہ عجیب دلچسپ مطابقت ہے کہ جیسا کہ نطفہ جسمانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جب تک رحم کی کشش اُس کی دستگیری نہ کرے وہ کچھ چیز ہی نہیں ایسا ہی حالتِ خشوع روحانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جب تک رحیم خدا کی کشش اُسکی دستگیری نہ کرے وہ حالتِ خشوع کچھ بھی چیز نہیں۔ اِسی لئے ہزارہا ایسے لوگوں کو پاؤ گے کہ اپنی عمر کے کسی حصہ میں یادِ الٰہی اور نماز میں حالت خشوع سے لذّت اٹھاتے اور وجد کرتے اور روتے تھے اور پھر کسی ایسی لعنت نے اُن کو پکڑ لیا کہ یک مرتبہ نفسانی امور کی طرف گر گئے اور دنیا اور دنیا کی خواہشوں کے جذبات سے وہ تمام حالت کھو بیٹھے۔ یہ نہایت خوف کا مقام ہے کہ اکثر وہ حالتِ خشوع رحیمیت کے تعلق سے پہلے ہی ضائع ہو جاتی ہے اور قبل اس کے کہ رحیم خدا کی کشش اس میں کچھ کام کرے وہ حالت برباد اور نابود ہو جاتی ہے اور ایسی صورت میں وہ حالت جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے اس نطفہ سے مشابہت رکھتی ہے کہ جو رحِم سے تعلق پکڑنے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ غرض روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے اور جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نطفہ ہے باہم اس بات میں تشابہ رکھتے ہیں کہ جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنی نطفہ بغیر کششِ رحم کے ہیچ ہے اور روحانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنی حالتِ خشوع بغیر جذبِ رحیم کے ہیچ اور جیسا کہ دنیا میں ہزارہا نطفے تباہ ہوتے ہیں ﴿۳۵﴾

اور نطفہ ہونے کی حالت میں ہی ضائع ہو جاتے ہیں اور رحم سے تعلق نہیں پکڑتے۔ ایسا ہی دنیا میں ہزارہا خشوع کی حالتیں ایسی ہیں کہ رحیم خدا سے تعلق نہیں پکڑتیں اور ضائع جاتی ہیں۔ ہزارہا جاہل اپنے چند روزہ خشوع اور وجد اور گریہ وزاری پر خوش ہو کر خیال کرتے ہیں کہ ہم ولی ہو گئے غوث ہو گئے قطب ہو گئے اور ابدال میں داخل ہو گئے اور خدا رسیدہ ہو گئے حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں ہنوز ایک نطفہ ہے۔ ابھی تو نام خدا ہے غنچہ صبا تو چُھو بھی نہیں گئی ہے۔ افسوس کہ انہیں خام خیالیوں سے ایک دنیا ہلاک ہو گئی۔ اور یاد رہے کہ یہ روحانی حالت کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے طرح طرح کے اسباب سے ضائع ہو سکتا ہے جیسا کہ نطفہ جو جسمانی حالت کا پہلا مرتبہ ہے انواع اقسام کے حوادث سے تلف ہو سکتا ہے منجملہ ان کے ذاتی نقص بھی ہے۔ مثلاً اس خشوع میں کوئی مشرکانہ ملونی ہے یا کسی بدعت کی آمیزش ہے یا اور لغویات کا ساتھ اشتراک ہے۔ مثلاً نفسانی خواہشیں اور نفسانی ناپاک جذبات بجائے خود زور مار رہے ہیں یا سفلی تعلقات نے دل کو پکڑ رکھا ہے یا جیفۂ دنیا کی لغو خواہشوں نے زیر کر دیا ہے پس ان تمام ناپاک عوارض کے ساتھ حالت خشوع اس لائق نہیں ٹھہرتی کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ ﴿۳۶﴾
جائے جیسا کہ اس نطفہ سے رحم تعلق نہیں پکڑ سکتا جو اپنے اندر کسی قسم کا نقص رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو جوگیوں کی حالت خشوع اور عیسائی پادریوں کی حالت انکساران کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور گو وہ سوز و گداز میں اس قدر ترقی کریں کہ اپنے جسم کو بھی ساتھ ہی استخوان بے پوست کر دیں تب بھی رحیم خدا اُن سے تعلق نہیں کرتا کیونکہ اُن کی حالت خشوع میں ایک ذاتی نقص ہے ایسا ہی وہ بدعتی فقیر اسلام کے جو قرآن شریف کی پیروی چھوڑ کر ہزاروں بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھنگ چرس اور شراب پینے سے بھی شرم نہیں کرتے اور دوسرے فسق و فجور بھی اُن کے لئے شیر مادر ہوتے ہیں چونکہ وہ ایسی حالت رکھتے ہیں کہ رحیم خدا سے اور اُس کے تعلق سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے بلکہ رحیم خدا کے نزدیک وہ تمام حالتیں

مکروہ ہیں اس لئے وہ باوجود اپنے طور کے وجد اور رقص اور اشعار خوانی اور سرود وغیرہ کے رحیم خدا کے تعلق سے سخت بے نصیب ہوتے ہیں اور اُس نطفہ کی طرح ہوتے ہیں جو آتشک کی بیماری یا جذام کے عارضہ سے جل جائے اور اس قابل نہ رہے کہ رحم اس سے تعلق پکڑ سکے پس رحم اور رحیم کا تعلق یا عدم تعلق ایک ہی بنا پر ہے صرف روحانی اور جسمانی عوارض کا فرق ہے۔ اور جیسا کہ نطفہ بعض اپنے ذاتی عوارض کی رُو سے اس لائق نہیں رہتا کہ رحم اس سے تعلق پکڑ سکے اور اس کو اپنی طرف کھینچ سکے ایسا ہی حالت خشوع جو نطفہ کے درجہ پر ہے بعض اپنے عوارض ذاتیہ کی وجہ سے جیسے تکبر اور عُجب اور ریا یا اور کسی قسم کی ضلالت کی وجہ سے یا شرک سے اس لائق نہیں رہتی کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ سکے پس نطفہ کی طرح تمام فضیلت روحانی وجود کے اوّل مرتبہ کی جو حالت خشوع ہے رحیم خدا کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے جیسا کہ تمام فضیلت نطفہ کی رحم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے پس اگر اس حالت خشوع کو اس رحیم خدا کے ساتھ حقیقی تعلق نہیں اور نہ حقیقی تعلق پیدا ہوسکتا ہے تو وہ حالت اُس گندے نطفہ کی طرح ہے جس کو رحم کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا نہیں ہوسکتا اور یاد رکھنا چاہیے کہ نماز اور یاد الٰہی میں جو کبھی انسان کو حالت خشوع میسر آتی ہے اور وجد اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے یا لذت محسوس ہوتی ہے یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس انسان کو رحیم خدا سے حقیقی تعلق ہے جیسا کہ اگر نطفہ اندام نہانی کے اندر داخل ہو جائے اور لذت بھی محسوس ہو تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اُس نطفہ کو رحم سے تعلق ہو گیا ہے بلکہ تعلق کے لئے علیحدہ آثار اور علامات ہیں۔ پس یاد الٰہی میں ذوق شوق جس کو دوسرے لفظوں میں حالت خشوع کہتے ہیں نطفہ کی اُس حالت سے مشابہ ہے جب وہ ایک صورتِ انزال پکڑ کر اندام نہانی کے اندر گر جاتا ہے اور اِس میں کیا شک ہے کہ وہ جسمانی عالم میں ایک کمال لذت کا وقت ہوتا ہے لیکن تاہم فقط اُس قطرہ منی کا اندر گرنا اس بات کو مستلزم نہیں ﴿۳۷﴾

کہ رِحم سے اُس نطفہ کا تعلق بھی ہو جائے اور وہ رحم کی طرف کھینچا جائے۔ پس ایسا ہی روحانی ذوق شوق اور حالتِ خشوع اس بات کو مستلزم نہیں کہ رحیم خدا سے ایسے شخص کا تعلق ہو جائے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔ بلکہ جیسا کہ نطفہ کبھی حرامکاری کے طور پر کسی رنڈی کے اندام نہانی میں پڑتا ہے تو اس میں بھی وہی لذت نطفہ ڈالنے والے کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اپنی بیوی کے ساتھ۔ پس ایسا ہی بُت پرستوں اور مخلوق پرستوں کا خشوع وخضوع اور حالتِ ذوق اور شوق رنڈی بازوں سے مشابہ ہے یعنی خشوع اور خضوع مشرکوں اور اُن لوگوں کا جو محض اغراض دنیویہ کی بنا پر خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اس نطفہ سے **مشابہت رکھتا ہے جو حرامکار عورتوں کے اندام نہانی میں جا کر** باعث لذت ہوتا ہے۔ بہرحال جیسا کہ نطفہ میں تعلق پکڑنے کی استعداد ہے حالت خشوع میں بھی تعلق پکڑنے کی استعداد ہے مگر صرف حالتِ خشوع اور رِقّت اور سوز اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ وہ تعلق ہو بھی گیا ہے جیسا کہ نطفہ کی صورت میں جو اس روحانی صورت کے مقابل پر ہی مشاہدہ ظاہر کر رہا ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے صحبت کرے اور منی عورت کے اندام نہانی میں داخل ہو جائے اور اس کو اس فعل سے کمال لذت حاصل ہو تو یہ لذت اس بات پر دلالت نہیں کرے گی کہ حمل ضرور ہو گیا ہے۔ پس ایسا ہی خشوع اور سوز و گداز کی حالت گو وہ کیسی ہی لذت اور سرور کے ساتھ ہو خدا سے تعلق پکڑنے کے لئے کوئی لازمی علامت نہیں ہے☆۔ یعنی کسی شخص میں نماز اور یادالٰہی کی حالت میں خشوع اور سوز و گداز اور گریہ و زاری پیدا ہونا لازمی طور پر اس بات کو

☆ ابتدائی حالت میں خشوع اور رِقت کے ساتھ ہر طرح کے لغو کام جمع ہو سکتے ہیں جیسا کہ بچہ میں رونے کی عادت بہت ہوتی ہے اور بات بات میں ڈر جاتا اور خشوع اور انکسار اختیار کرتا ہے مگر باایں ہمہ بچپن کے زمانہ میں طبعًا انسان بہت سے لغویات میں مبتلا ہوتا ہے اور سب سے پہلے لغو باتوں اور لغو کاموں کی طرف ہی رغبت کرتا ہے اور اکثر لغو حرکات اور لغو طور پر کودنا اور اچھلنا ہی اس کو پسند آتا ہے جس میں بسا اوقات اپنے جسم کو بھی کوئی صدمہ پہنچا دیتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کی راہ میں فطرتًا پہلے لغویات ہی آتے ہیں اور بغیر اس مرتبہ کے طے کرنے کے دوسرے مرتبہ تک وہ پہنچ ہی نہیں سکتا۔ پس طبعًا پہلا زینہ بلوغ کا بچپن کے لغویات سے پرہیز کرنا ہے سو اس سے ثابت ہے کہ سب سے پہلا تعلق انسانی سرشت کو لغویات سے ہی ہوتا ہے۔ منہ

﴿۳۸﴾ مستلزم نہیں کہ اس شخص کو خدا سے تعلّق بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب حالات کسی شخص میں موجود ہوں مگر ابھی اس کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہ ہو۔ جیسا کہ مشاہدہ صریحہ اس بات پر گواہ ہے کہ بہت سے لوگ پند و نصیحت کی مجلسوں اور وعظ و تذکیر کی محفلوں یا نماز اور یاد الٰہی کی حالت میں خوب روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں اور آنسو اُن کے رخساروں پر پانی کی طرح رواں ہو جاتے ہیں بلکہ بعض کا رونا تو مُنہ پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک بات سنی اور رو ہیں رو دیا۔ مگر تاہم لغویات سے وہ کنارہ کش نہیں ہوتے اور بہت سے لغو کام اور لغو باتیں اور لغو سیر و تماشے اُن کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ جن سے سمجھا جاتا ہے کہ کچھ بھی اُن کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں اور نہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کچھ اُن کے دلوں میں ہے۔ پس یہ عجیب تماشا ہے کہ ایسے گندے نفسوں کے ساتھ بھی خشوع اور سوز و گداز کی حالت جمع ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبرت کا مقام ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مجرد خشوع اور گریہ وزاری کہ جو بغیر ترک لغویات ہو کچھ فخر کرنے کی جگہ نہیں اور نہ یہ قرب الٰہی اور تعلق باللہ کی کوئی علامت ہے۔ بہت سے ایسے فقیر مَیں نے بچشم خود دیکھے ہیں اور ایسا ہی بعض دوسرے لوگ بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ کسی دردناک شعر کے پڑھنے یا دردناک نظارہ دیکھنے یا دردناک قصہ کے سننے سے اس جلدی سے ان کے آنسو گرنے شروع ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض بادل اس قدر جلدی سے اپنے موٹے موٹے قطرے برساتے ہیں کہ باہر سونے والوں کو رات کے وقت فرصت نہیں دیتے کہ اپنا بستر بغیر تر ہونے کے اندر لے جاسکیں لیکن مَیں اپنی ذاتی شہادت سے گواہی دیتا ہوں کہ اکثر ایسے شخص میں نے بڑے مکّار بلکہ دنیاداروں سے آگے بڑھے ہوئے پائے ہیں اور بعض کو میں نے ایسے خبیث طبع اور بد دیانت اور ہر پہلو سے بدمعاش پایا ہے کہ مجھے اُن کی گریہ وزاری کی عادت اور خشوع و خضوع کی خصلت دیکھ کر اس بات سے کراہت آتی ہے کہ کسی مجلس میں ایسی رقت اور سوز و گداز ظاہر کروں۔ ہاں کسی زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ نیک بندوں کی علامت تھی مگر اب تو اکثر یہ پیرایہ مکّاروں اور فریب دہ لوگوں کا ہو گیا ہے

﴿۳۹﴾ سبز کپڑے، بال سر کے لمبے، ہاتھ میں تسبیح، آنکھوں سے دمبدم آنسو جاری، لبوں میں کچھ حرکت گویا ہر وقت ذکر الٰہی زبان پر جاری ہے اور ساتھ اس کے بدعت کی پابندی۔ یہ علامتیں اپنے فقر کی ظاہر کرتے ہیں مگر دل مجذوم محبت الٰہی سے محروم۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ راستباز لوگ میری اس تحریر سے مستثنیٰ ہیں جن کی ہر ایک بات بطور جوش اور حال کے ہوتی ہے نہ بطور تکلف اور قال کے۔ بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ گریہ وزاری اور خشوع اور خضوع نیک بندوں کے لئے کوئی مخصوص علامت نہیں بلکہ یہ بھی انسان کے اندر ایک قوت ہے جو محل اور بے محل دونوں صورتوں میں حرکت کرتی ہے۔ انسان بعض اوقات ایک فرضی قصہ پڑھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ فرضی اور ایک ناول کی قسم ہے مگر تاہم جب اس کے ایک دردناک موقعہ پر پہنچتا ہے تو اس کا دل اپنے قابو سے نکل جاتا ہے اور بے اختیار آنسو جاری ہوتے ہیں جو تھمتے نہیں۔ ایسے دردناک قصے یہاں تک مؤثر پائے گئے ہیں کہ بعض وقت خود ایک انسان ایک پُرسوز قصہ بیان کرنا شروع کرتا ہے اور جب بیان کرتے کرتے اس کے ایک پُر درد موقعہ پر پہنچتا ہے تو آپ ہی چشم پُرآب ہو جاتا ہے اور اس کی آواز بھی ایک رونے والے شخص کے رنگ میں ہو جاتی ہے آخر اس کا رونا اچھل پڑتا ہے اور جو رونے کے اندر ایک قسم کی سرور اور لذت ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ جس بنا پر وہ روتا ہے وہ بنا ہی غلط اور ایک فرضی قصہ ہے۔ پس کیوں اور کیا وجہ کہ ایسا ہوتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ سوز و گداز اور گریہ وزاری کی قوت جو انسان کے اندر موجود ہے اُس کو ایک واقعہ کے صحیح یا غلط ہونے سے کچھ کام نہیں بلکہ جب اس کے لئے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو اس قوت کو حرکت دینے کے قابل ہوتے ہیں تو خواہ نخواہ وہ رقت حرکت میں آجاتی ہے اور ایک قسم کا سرور اور لذت ایسے انسان کو پہنچ جاتا ہے گو وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی وجہ سے غیر مشروع مجالس میں بھی جو طرح طرح کی بدعات پر مشتمل ہوتی ہیں بے قید لوگ جو فقیروں کے لباس میں اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں مختلف قسم کی کافیوں اور

شعروں کے سننے اور سُرود کی تاثیر سے رقص اور وجد اور گریہ وزاری شروع کر دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں لذت اُٹھاتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ہم خدا کو مل گئے ہیں مگر یہ لذت اُس لذت سے مشابہ ہے جو ایک زانی کو حرامکار عورت سے ہوتی ہے۔

﴿۴۰﴾ اور پھر ایک اور مشابہت خشوع اور نطفہ میں ہے اور وہ یہ کہ جب ایک شخص کا نطفہ اس کی بیوی یا کسی اور عورت کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس نطفہ کا اندام نہانی کے اندر داخل ہونا اور انزال کی صورت پکڑ کر رواں ہو جانا بعینہٖ رونے کی صورت پر ہوتا ہے جیسا کہ خشوع کی حالت کا نتیجہ بھی رونا ہی ہوتا ہے اور جیسے بے اختیار نطفہ اُچھل کر صورت انزال اختیار کرتا ہے۔ یہی صورت کمال خشوع کے وقت میں رونے کی ہوتی ہے کہ رونا آنکھوں سے اُچھلتا ہے اور جیسی انزال کی لذت کبھی حلال طور پر ہوتی ہے جب کہ اپنی بیوی سے انسان صحبت کرتا ہے اور کبھی حرام طور پر جب کہ انسان کسی حرام کار عورت سے صحبت کرتا ہے۔ یہی صورت خشوع اور سوز و گداز اور گریہ وزاری کی ہے یعنی کبھی خشوع اور سوز و گداز محض خدائے واحد لاشریک کے لئے ہوتا ہے جس کے ساتھ کسی بدعت اور شرک کا رنگ نہیں ہوتا۔ پس وہ لذت سوز و گداز کی ایک لذت حلال ہوتی ہے مگر کبھی خشوع اور سوز و گداز اور اسکی لذت بدعات کی آمیزش سے یا مخلوق کی پرستش اور بتوں اور دیویوں کی پوجا میں بھی حاصل ہوتی ہے مگر وہ لذت حرامکاری کے جماع سے مشابہ ہوتی ہے۔ غرض مجرد خشوع اور سوز و گداز اور گریہ وزاری اور اس کی لذتیں تعلق باللہ کو مستلزم نہیں بلکہ جیسا کہ بہت سے ایسے نطفے ہیں جو ضائع جاتے ہیں اور رحم اُن کو قبول نہیں کرتا۔ ایسا ہی بہت سے خشوع اور تضرع اور زاری ہیں جو محض آنکھوں کو کھونا ہے اور رحیم خدا ان کو قبول نہیں کرتا۔ غرض حالت خشوع کو جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے نطفہ ہونے کی حالت سے جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے ایک کھلی کھلی مشابہت ہے جس کو ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور یہ مشابہت کوئی معمولی امر نہیں ہے بلکہ صانع قدیم جلّ شانہٗ کے خاص ارادہ سے ان دونوں میں اکمل اور اتم مشابہت ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں بھی لکھا گیا ہے کہ

دوسرے جہان میں بھی یہ دونوں لذّتیں ہوں گی۔ مگر مشابہت میں اس قدر ترقی کر جائیں گی کہ ایک ہی ہو جائیں گی یعنی اُس جہان میں جو ایک شخص اپنی بیوی سے محبت اور اختلاط کرے گا وہ اس بات میں فرق نہیں کر سکے گا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت اور اختلاط کرتا ہے یا محبت الٰہیہ کے دریائے بے پایاں میں غرق ہے اور واصلانِ حضرتِ عزت پر اِسی جہان میں یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اہل دنیا اور محجوبوں کے لئے ایک امر فوق الفہم ہے۔ ﴿۴۱﴾

اب ہم یہ تو بیان کر چکے کہ روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالت خشوع ہے جسمانی وجود کے پہلے مرتبہ سے جو نطفہ ہے مشابہت تام رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ سے مشابہ اور مماثل ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ رُوحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ[1] یعنی مومن وہ ہیں جو لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں اور لغو تعلقات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے کلام عزیز میں عَلَقَہ کے نام سے موسوم فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً[2] یعنی پھر ہم نے نطفہ کو عَلَقَہ بنایا یعنی ہم نے اُس کو لغو طور پر ضائع ہونے سے بچا کر رحم کی تاثیر اور تعلق سے عَلَقَہ بنا دیا۔ اس سے پہلے وہ معرض خطر میں تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ انسانی وجود بنے یا ضائع جائے لیکن وہ رحم کے تعلق کے بعد ضائع ہونے سے محفوظ ہو گیا اور اس میں ایک تغیر پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا یعنی وہ ایک جمے ہوئے خون کی صورت میں ہو گیا۔ اور قوام بھی غلیظ ہو گیا اور رحم سے اس کا ایک علاقہ ہو گیا اس لئے اس کا نام عَلَقَہ رکھا گیا اور ایسی عورت حاملہ کہلانے کی مستحق ہو گئی۔ اور بوجہ اس علاقہ کے رحم اس کا سرپرست بن گیا اور اس کے زیر سایہ نطفہ کا نشو ونما ہونے لگا مگر اس حالت میں نطفہ نے کچھ زیادہ پاکیزگی حاصل نہیں کی۔

[1] المؤمنون: ۴ [2] المؤمنون: ۱۵

صرف ایک خون جما ہوا بن گیا اور رحم کے تعلق کی وجہ سے ضائع ہونے سے بچ گیا اور جس طرح اور صورتوں میں ایک نطفہ لغو طور پر پھیلتا اور بیہودہ طور پر اندر سے بہ نکلتا اور کپڑوں کو پلید کرتا تھا اب اس تعلق کی وجہ سے بیکار جانے سے محفوظ رہ گیا۔ لیکن ہنوز وہ ایک جما ہوا خون تھا جس نے ابھی نجاست خفیفہ کی آلودگی سے پاکی حاصل نہیں کی تھی۔ اگر رحم سے یہ تعلق اس کا پیدا نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اندام نہانی میں داخل ہو کر بھی رحم میں قرار نہ پا سکتا اور باہر کی طرف بہ جاتا مگر رحم کی قوت مدبّرہ نے اپنے خاص جذب سے اُس کو تھام لیا اور پھر ایک جمے ہوئے خون کی شکل پر بنا دیا۔ تب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس تعلق کی وجہ سے **علقہ** کہلایا اور اس سے پہلے رحم نے اُس پر کوئی اپنا خاص اثر ظاہر نہیں کیا تھا اور اسی اثر نے اس کو ضائع ہونے سے روکا اور اسی اثر سے نطفہ کی طرح اُس میں رقّت بھی باقی نہ رہی یعنی اس کا قوام رکیک اور پتلا نہ رہا بلکہ کسی قدر گاڑھا ہو گیا۔ ﴿۴۲﴾

اور اس **علقہ** کے مقابل پر جو جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ ہے روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کا ابھی ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں جس کی طرف قرآن شریف کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی رہائی یافتہ مومن وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں اور لغو باتوں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں سے اور لغو تعلقات سے اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور ایمان ان کا اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس قدر کنارہ کشی اُن پر سہل ہو جاتی ہے کیونکہ بوجہ ترقیٔ ایمان کے کسی قدر تعلق اُن کا خدائے رحیم سے ہو جاتا ہے جیسا کہ **علقہ** ہونے کی حالت میں جب نطفہ کا تعلق کسی قدر رحم سے ہو جاتا ہے تو وہ لغو طور پر گر جانے یا بہ جانے یا اور طور پر ضائع ہو جانے سے امن میں آ جاتا ہے اِلَّا ماشاء اللّٰہ۔ سو روحانی وجود کے اس مرتبہ دوم میں خدائے رحیم سے تعلق بعینہٖ اُس تعلق سے مشابہ ہوتا ہے جو جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر **علقہ** کو

رحم سے تعلق ہو جاتا ہے اور جیسا کہ قبل ظہور دوسرے مرتبہ وجود روحانی کے لغو تعلقات اور لغو شغلوں سے رہائی پانا غیر ممکن ہوتا ہے اور صرف وجود روحانی کا پہلا مرتبہ یعنی خشوع اور عجز و نیاز کی حالت اکثر برباد بھی چلی جاتی ہے اور انجام بد ہوتا ہے۔ ایسا ہی نطفہ بھی جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے علقہ بننے کی حالت سے پہلے بسا اوقات صدہا مرتبہ لغو طور پر ضائع جاتا ہے پھر جب ارادہ الٰہی اس بات کے متعلق ہوتا ہے کہ لغو طور پر ضائع ہونے سے اس کو بچائے تو اُس کے امر اور اذن سے وہی نطفہ رحم میں علقہ بن جاتا ہے تب وہ وجود جسمانی کا دوسرا مرتبہ کہلاتا ہے غرض دوسرا مرتبہ روحانی وجود کا جو تمام لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا اور لغو باتوں اور لغو تعلقات اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہونا ہے یہ **مرتبہ** بھی اسی وقت میسر آتا ہے کہ جب خدائے رحیم سے انسان کا **تعلق** پیدا ہو جائے کیونکہ یہ تعلق میں ہی طاقت اور قوت ہے کہ دوسرے تعلق کو توڑتا ہے اور ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور گو انسان کو ﴿۴۳﴾
اپنی نماز میں حالت خشوع میسر آ جائے جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے پھر بھی وہ خشوع لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو جوشوں سے روک نہیں سکتا۔ جب تک کہ **خدا سے وہ تعلق نہ ہو** جو روحانی وجود کے **دوسرے مرتبہ** پر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ گو ایک انسان اپنی بیوی سے ہر روز کئی دفعہ صحبت کرے تاہم وہ نطفہ ضائع ہونے سے رُک نہیں سکتا جب تک کہ رحم سے اس کا تعلق پیدا نہ ہو جائے۔

پس خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ اس کے یہی معنے ہیں کہ مومن وہی ہیں جو لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرتے ہیں اور لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرنا خدا تعالیٰ کے تعلق کا موجب ہے☆۔ گویا لغو باتوں سے دل کو

☆ لغو تعلقات سے الگ ہونا خدا تعالیٰ کے تعلق کا اس لئے موجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں آیات میں اَفْلَحَ کے لفظ کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص خدا کی طلب میں کوئی کام

چھڑانا خدا سے دل کو لگا لینا ہے کیونکہ انسان تعبّد ابدی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور طبعی طور پر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجود ہے پس اسی وجہ سے انسان کی روح کو خدا تعالیٰ سے ایک تعلق **ازلی** ہے۔ جیسا کہ آیت اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى [1] سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ تعلق جو انسان کو رحیمیّت کے پرتوہ کے نیچے آ کر یعنی عبادات کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے جس تعلق کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان لا کر ہر ایک لغو بات اور لغو کام اور لغو مجلس اور لغو حرکت اور لغو تعلق اور لغو جوش سے کنارہ کشی کی جائے۔ وہ اُسی ازلی تعلق کو مکمن قوت سے حیّزِ فعل میں لانا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انسان کے روحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نماز اور یادِ الٰہی میں حالتِ خشوع اور رقّت اور سوز و گداز ہے یہ مرتبہ اپنی ذات میں صرف اطلاق کی حیثیت رکھتا ہے یعنی نفس خشوع کے لئے یہ لازمی امر نہیں ہے کہ ترکِ لغویات بھی ساتھ ہی ہو یا اس سے بڑھ کر کوئی اخلاقِ فاضلہ اور عاداتِ مہذبہ ساتھ ہوں بلکہ ممکن ہے کہ جو شخص نماز میں خشوع اور رقّت و سوز اور گریہ وزاری اختیار کرتا ہے خواہ اس قدر کہ دوسرے پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے ہنوز لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو تعلقوں اور لغو نفسانی جوشوں سے اس کا دل پاک نہ ہو یعنی ممکن ہے کہ ہنوز معاصی سے اس کو رُستگاری نہ ہو کیونکہ خشوع کی حالت کا ﴿۴۴﴾

بقیہ حاشیہ

کرے گا وہ بقدر محنت کشی اور بقدر اپنی سعی کے خدا کو پائے گا۔ اور اس سے تعلق پیدا کر لے گا۔ پس جو شخص خدا کا تعلق حاصل کرنے کے لئے لغو کام چھوڑتا ہے اس کو اس وعدہ کے موافق جو لفظ افلح میں ہے ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو اس نے کام کیا ہے وہ بھی بڑا بھاری کام نہیں صرف ایک خفیف تعلق کو جو اس کو لغویات سے تھا چھوڑ دیا ہے اور یاد رہے کہ جیسا کہ لفظ **افلح** اول آیت میں موجود ہے یعنی اس آیت میں کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ [2] یہی لفظ عطف کے طور پر تمام آئندہ آیتوں سے وعدہ کے طور پر متعلق ہے۔ پس یہ آیت کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ [3] یہی معنی رکھتی ہے کہ **قد أفلح المؤمنون الذين هم عن اللغو معرضون** اور افلاح یعنی **افلح** کا لفظ ہر یک مرتبہ ایمان پر ایک خاص معنی رکھتا ہے اور ایک خاص تعلق کا وعدہ دیتا ہے۔ منہ

[1] الاعراف:۱۷۳ [2] المؤمنون:۲،۳ [3] المؤمنون:۴

کبھی کبھی دل پر وارد ہونا یا نماز میں ذوق اور سرور حاصل ہونا یہ اور چیز ہے اور طہارتِ نفس اور چیز۔ اور گو کسی سالک کا خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز بدعت اور شرک کی آمیزش سے پاک بھی ہوتا ہم ایسا آدمی جس کا وجود روحانی ابھی مرتبہ دوم تک نہیں پہنچا ابھی صرف قبلہ رُوحانی کا قصد کر رہا ہے اور راہ میں سرگردان ہے اور ہنوز اُس کی راہ میں طرح طرح کے دشت و بیابان اور خارستان اور کوہستان اور بحرِ عظیم پُر طوفان اور درندگان دشمن ایمان و دشمن جان قدم قدم پر بیٹھے ہیں تا وقتیکہ وجود روحانی کے دوسرے مرتبہ تک نہ پہنچ جائے۔

یاد رہے کہ خشوع اور عجز و نیاز کی حالت کو یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے کہ خدا سے سچا تعلق ہو جائے بلکہ بسا اوقات شریر لوگوں کو بھی کوئی نمونہ قہر الٰہی دیکھ کر خشوع پیدا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ان کو کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا اور نہ لغو کاموں سے ابھی رہائی ہوتی ہے۔ مثلاً وہ زلزلہ جو چاؔر پریل ۱۹۰۵ء کو آیا تھا اُس کے آنے کے وقت لاکھوں دلوں میں ایسا خشوع اور سوز و گداز پیدا ہوا تھا کہ بجز خدا کے نام لینے اور رونے کے اور کوئی کام نہ تھا یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اپنا دہریہ پن بھول گیا تھا۔ اور پھر جب وہ وقت جاتا رہا اور زمین ٹھہر گئی تو حالت خشوع نابود ہو گئی یہاں تک کہ میں نے سنا ہے کہ بعض دہریوں نے جو اس وقت خدا کے قائل ہو گئے تھے بڑی بے حیائی اور دلیری سے کہا کہ ہمیں غلطی لگ گئی تھی کہ ہم زلزلہ کے رعب میں آ گئے ورنہ خدا نہیں ہے۔ غرض جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں خشوع کی حالت کے ساتھ بہت گند جمع ہو سکتے ہیں البتہ وہ تمام آئندہ کمالات کے لئے تخم کی طرح ہے مگر اسی حالت کو کمال سمجھنا اپنے نفس کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ بعد اس کے ایک اور مرتبہ ہے جس کی تلاش مومن کو کرنی چاہیے اور کبھی آرام نہیں لینا چاہیے اور سست نہیں ہونا چاہیے جب تک وہ رتبہ حاصل نہ ہو جائے اور وہ وہی مرتبہ ہے جس کو کلامِ الٰہی نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ[1] یعنی مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو نماز میں خشوع اختیار کرتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان سے

[1] المؤمنون:۴

﴿۴۵﴾ بڑھ کر وہ مومن ہیں کہ جو باوجود خشوع اور سوز و گداز کے تمام لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو تعلقوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اپنی خشوع کی حالت کو بیہودہ کاموں اور لغو باتوں کے ساتھ ملا کر ضائع اور برباد ہونے نہیں دیتے اور طبعاً تمام لغویات سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور بیہودہ باتوں اور بیہودہ کاموں سے ایک کراہت اُن کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہوتی ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق ہو گیا ہے کیونکہ ایک طرف سے انسان تب ہی منہ پھیرتا ہے جب دوسری طرف اس کا تعلق ہو جاتا ہے۔ پس دنیا کی لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو سیر و تماشا اور لغو صحبتوں سے واقعی طور پر اُسی وقت انسان کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے جب دل کا خدائے رحیم سے تعلق ہو جائے اور دل پر اس کی عظمت اور ہیبت غالب آ جائے۔ ایسا ہی نطفہ بھی اسی وقت لغو طور پر ضائع ہو جانے سے محفوظ ہوتا ہے جب رحم سے اس کا تعلق ہو جائے اور رحم کا اثر اس پر غالب آ جائے اور اس تعلق کے وقت نطفہ کا نام علقہ ہو جاتا ہے۔ پس اسی طرح روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جو مومن کا **مُعرض عن اللغو** ہونا ہے روحانی طور پر علقہ ہے کیونکہ اسی مرتبہ پر مومن کے دل پر ہیبت اور عظمت الٰہی وارد ہو کر اس کو لغو باتوں اور لغو کاموں سے چھڑاتی ہے اور ہیبت اور عظمتِ الٰہی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو چھوڑ دینا یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں تعلق باللہ کہتے ہیں لیکن یہ تعلق جو صرف لغویات کے ترک کرنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے یہ ایک خفیف تعلق ہے کیونکہ اس مرتبہ پر مومن صرف لغویات سے تعلق توڑتا ہے لیکن نفس کی ضروری چیزوں سے اور ایسی باتوں سے جن پر معیشت کی آسودگی کا حصہ ہے ابھی اس کے دل کا تعلق ہوتا ہے اس لئے ہنوز ایک حصہ پلیدی کا اس کے اندر رہتا ہے۔ اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے وجودِ روحانی کے اس مرتبہ کو علقہ سے مشابہت دی ہے اور علقہ خون جما ہوا ہوتا ہے جس میں باعث خون ہونے کے ایک حصہ پلیدی کا باقی ہوتا ہے اور اس مرتبہ میں یہ نقص اس لئے رہ جاتا ہے کہ ایسے لوگ پورے طور پر خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں اور

پورے طور پر ان کے دلوں میں حضرت عزت جلّ شَانہٗ کی عظمت اور ہیبت نہیں بیٹھی اس لئے صرف نکمی اور لغو باتوں کے چھوڑنے پر قادر ہو سکتے ہیں نہ اور باتوں پر۔ پس ناچار اس قدر پلیدی ﴿۴۶﴾
اُن کے نفوس ناقصہ میں رہ جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ایک خفیف سا تعلق پیدا کر کے لغویات سے تو کنارہ کش ہو جاتے ہیں لیکن وہ ان کاموں کو چھوڑ نہیں سکتے جن کا چھوڑنا نفس پر بہت بھاری ہے یعنی وہ خدا تعالیٰ کے لئے ان چیزوں کو چھوڑ نہیں سکتے جو نفسانی لذات کے لئے لوازم ضروریہ ہیں اِس بیان سے ظاہر ہے کہ محض لغویات سے منہ پھیرنا ایسا امر نہیں ہے جو بہت قابل تحسین ہو بلکہ یہ مومن کی ایک ادنیٰ حالت ہے ہاں خشوع کی حالت سے ایک درجہ ترقی پر ہے۔

اور جسمانی وجود کے تیسرے درجہ کے مقابل پر روحانی وجود کا تیسرا درجہ واقع ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جسمانی وجود کا تیسرا مرتبہ یہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً[1] یعنی پھر بعد اس کے ہم نے علقہ کو بوٹی بنایا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں وجود جسمانی انسان کا ناپاکی سے باہر آتا ہے اور پہلے سے اس میں کسی قدر شدت اور صلابت بھی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ نطفہ اور خون جما ہوا جو علقہ ہے وہ دونوں ایک نجاستِ خفیفہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور اپنے قوام کے رو سے بھی بہ نسبت مضغہ کے نرم اور رقیق ہیں مگر مضغہ جو ایک گوشت کا ٹکڑہ ہوتا ہے پاک حالت اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے قوام میں بھی ایک حد تک سختی پیدا کر لیتا ہے۔ یہی حالت روحانی وجود کے تیسرے درجہ کی ہے اور روحانی وجود کا تیسرا درجہ وہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ[2] اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ وہ مومن کہ جو پہلی دو حالتوں سے بڑھ کر قدم رکھتا ہے وہ صرف بیہودہ اور لغو باتوں سے ہی کنارہ کش نہیں ہوتا بلکہ بخل کی پلیدی کو دُور کرنے کے لئے جو طبعًا ہر ایک انسان کے اندر ہوتی ہے زکوٰۃ بھی دیتا ہے یعنی خدا کی راہ میں ایک حصہ اپنے مال کا خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کا نام اسی لئے زکوٰۃ ہے کہ انسان اس کی بجا آوری سے یعنی اپنے مال کو جو اس کو بہت پیارا ہے لِلّٰہ دینے سے بخل کی پلیدی سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور جب بخل کی پلیدی جس سے انسان طبعًا بہت تعلق رکھتا ہے انسان کے اندر سے نکل جاتی ہے تو وہ کسی حد تک پاک بن کر

[1] المؤمنون : ۱۵ [2] المؤمنون: ۵

﴿۴۷﴾ خدا سے جو اپنی ذات میں پاک ہے ایک مناسبت پیدا کر لیتا ہے ؎

کوئی اُس پاک سے جو دل لگاوے کرے پاک آپ کو تب اُس کو پاوے

اور یہ مرتبہ پہلی دو حالتوں میں پایا نہیں جاتا۔ کیونکہ صرف خشوع اور عجز و نیاز یا صرف لغو باتوں کو ترک کرنا ایسے انسان سے بھی ہوسکتا ہے جس میں ہنوز بخل کی پلیدی موجود ہے لیکن جب انسان خدا تعالیٰ کے لئے اپنے اس مال عزیز کو ترک کرتا ہے جس پر اس کی زندگی کا مدار اور معیشت کا انحصار ہے اور جو محنت اور تکلیف اور عرقریزی سے کمایا گیا ہے تب بخل کی پلیدی اس کے اندر سے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایمان میں بھی ایک شدت اور صلابت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دونوں حالتیں مذکورہ بالا جو پہلے اس سے ہوتی ہیں اُن میں یہ پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک چھپی ہوئی پلیدی ان کے اندر رہتی ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ لغویات سے منہ پھیرنے میں صرف ترکِ شر ہے اور شر بھی ایسی جس کی زندگی اور بقا کے لئے کچھ ضرورت نہیں اور نفس پر اس کے ترک کرنے میں کوئی مشکل نہیں لیکن اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کی خوشنودی کے لئے دینا یہ کسبِ خیر ہے جس سے وہ نفس کی ناپاکی جو سب ناپاکیوں سے بدتر ہے یعنی بخل دور ہوتا ہے لہٰذا یہ ایمانی حالت کا تیسرا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں سے اشرف اور افضل ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کے تیار ہونے میں مضغہ کا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں نطفہ اور علقہ سے فضیلت میں بڑھ کر ہے اور پاکی میں خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ نطفہ اور علقہ دونوں نجاست خفیفہ سے ملوث ہیں مگر مضغہ پاک حالت میں ہے اور جس طرح رحم میں مضغہ کو بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے ایک ترقی یافتہ حالت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے رحم سے اس کا تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے یہی حالت وجود روحانی کی مرتبہ سوم کی ہے جس کی تعریف خدا تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ[1] یعنی مومن وہ ہیں جو اپنے نفس کو بخل سے پاک

[1] المؤمنون: ۵

کرنے کے لئے اپنا عزیز مال خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور اس فعل کو وہ آپ اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں۔ پس وجود روحانی کی اس مرتبہ سوم میں وہی تین۳ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو وجود جسمانی کے مرتبہ سوم میں یعنی مضغہ ہونے کی حالت میں پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ حالت جو بخل سے پاک ہونے کے لئے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور اپنی محنت سے حاصل کردہ ﴿۴۸﴾ سرمایہ محض لِلّٰہ دوسرے کو دینا بہ نسبت اس حالت کے جو محض لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا ہے ایک ترقی یافتہ حالت ہے اور اس میں صریح اور بدیہی طور پر بخل کی پلیدی سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بڑھتا ہے کیونکہ اپنے مال عزیز کو خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو باتوں کے چھوڑنے کے زیادہ تر نفس پر بھاری ہے اس لئے اس زیادہ تکلیف اٹھانے کے کام سے خدا سے تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور بباعث ایک مشقت کا کام بجالانے کے ایمانی شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب اس کے بعد روحانی وجود کا چوتھا درجہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ[1] یعنی تیسرے درجہ سے بڑھ کر مومن وہ ہیں جو اپنے تئیں نفسانی جذبات اور شہوات ممنوعہ سے بچاتے ہیں۔ یہ درجہ تیسرے درجہ سے اس لئے بڑھ کر ہے کہ تیسرے درجہ کا مومن تو صرف مال کو جو اُس کے نفس کو نہایت پیارا اور عزیز ہے خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے لیکن چوتھے۴ درجہ کا مومن وہ چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں نثار کرتا ہے جو مال سے بھی زیادہ پیاری اور محبوب ہے یعنی شہوات نفسانیہ کیونکہ انسان کو اپنی شہواتِ نفسانیہ سے اس قدر محبت ہے کہ وہ اپنی شہوات کے پورا کرنے کے لئے اپنے مال عزیز کو پانی کی طرح خرچ کرتا ہے اور ہزار ہا روپیہ شہوات کے پورا کرنے کے لئے برباد کر دیتا ہے اور شہوات کے حاصل کرنے کے لئے مال کو کچھ بھی چیز نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے نجس طبع اور بخیل لوگ جو ایک محتاج بھوکے اور ننگے کو بباعث سخت بخل کے ایک پیسہ بھی دے نہیں سکتے شہوات نفسانیہ کے جوش میں بازاری عورتوں کو ہزار ہا روپیہ

[1] المؤمنون:٦

دے کر اپنا گھر ویران کر لیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ سیلاب شہوت ایسا تُند اور تیز ہے کہ بخل جیسی نجاست کو بھی بہالے جاتا ہے۔ اس لئے یہ بدیہی امر ہے کہ بہ نسبت اس قوت ایمانی کے جس کے ذریعہ سے بخل دور ہوتا ہے اور انسان اپنا عزیز مال خدا کے لئے دیتا ہے یہ قوتِ ایمانی جس کے ذریعہ سے انسان شہواتِ نفسانیہ کے طوفان سے بچتا ہے نہایت زبردست اور شیطان کا مقابلہ کرنے میں نہایت سخت اور نہایت دیرپا ہے کیونکہ اس کا کام یہ ہے کہ نفس امارہ جیسے پرانے اژدہا کو اپنے پیروں کے نیچے کچل ڈالتی ہے۔ اور بخل تو شہوات نفسانیہ کے پورا کرنے ﴿۴۹﴾
کے جوش میں اور نیز ریا اور نمود کے وقتوں میں بھی دور ہوسکتا ہے مگر یہ طوفان جو نفسانی شہوات کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہایت سخت اور دیرپا طوفان ہے جو کسی طرح بجز رحم خداوندی کے دور ہو ہی نہیں سکتا اور جس طرح جسمانی وجود کے تمام اعضاء میں سے ہڈی نہایت سخت ہے اور اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے اسی طرح اس طوفان کے دور کرنے والی قوتِ ایمانی نہایت سخت اور عمر بھی لمبی رکھتی ہے تا ایسے دشمن کا دیر تک مقابلہ کر کے پامال کر سکے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے رحم سے کیونکہ شہواتِ نفسانیہ کا طوفان ایک ایسا ہولناک اور پُر آشوب طوفان ہے کہ بجز خاص رحم حضرت احدیت کے فرو نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے حضرت **یوسف** کو کہنا پڑا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ[1] یعنی میں اپنے نفس کو بَری نہیں کرتا نفس نہایت درجہ بدی کا حکم دینے والا ہے اور اس کے حملہ سے مخلصی غیر ممکن ہے مگر یہ کہ خود خدا تعالیٰ رحم فرماوے۔ اس آیت میں جیسا کہ فقرہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ہے طوفان نوح کے ذکر کے وقت بھی اسی کے مشابہ الفاظ ہیں کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ[2] پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طوفان شہواتِ نفسانیہ اپنی عظمت اور ہیبت میں نوح کے طوفان سے مشابہ ہے۔

[1] یوسف:۵۴ [2] ھود:۴۴

اور اس درجہ روحانی کے مقابل پر جو وجودِ روحانی کا چوتھا درجہ ہے جسمانی وجود کا درجہ چہارم ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا[1] یعنی پھر ہم نے مُضغہ سے ہڈیاں بنائیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہڈیوں میں بہ نسبت مضغہ یعنی بوٹی کے زیادہ صلابت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور نیز ہڈی بہ نسبت مضغہ کے بہت دیرپا ہے اور ہزاروں برس تک اس کا نشان رہ سکتا ہے پس وجود روحانی کے درجہ چہارم اور وجود جسمانی کے درجہ چہارم میں مشابہت ظاہر ہے کیونکہ وجود روحانی کے درجہ چہارم میں بہ نسبت وجود روحانی کے درجہ سوم کے ایمانی شدّت اور صلابت زیادہ ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بھی زیادہ۔ ایسا ہی وجود جسمانی کے درجہ چہارم میں جو استخوان کا پیدا ہونا ہے بہ نسبت درجہ سوم وجود جسمانی کے جو محض مضغہ یعنی بوٹی ہے جسمانی طور پر شدت اور صلابت زیادہ ہے اور رحم سے تعلق بھی زیادہ۔ ﴿۵۰﴾

پھر چہارم درجہ کے بعد پانچواں درجہ وجود روحانی کا وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[2] یعنی پانچویں درجہ کے مومن جو چوتھے درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو صرف اپنے نفس میں یہی کمال نہیں رکھتے جو نفسِ امّارہ کی شہوات پر غالب آ گئے ہیں اور اس کے جذبات پر اُن کو فتح عظیم حاصل ہوگئی ہے بلکہ وہ حتی الوسع خدا اور اس کی مخلوق کی تمام امانتوں اور تمام عہدوں کے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھ کر تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جہاں تک طاقت ہے اس راہ پر چلتے ہیں۔ خدا کے عہدوں سے مراد وہ ایمانی عہد ہیں جو بیعت اور ایمان لانے کے وقت مومن سے لئے جاتے ہیں جیسے شرک نہ کرنا خونِ ناحق نہ کرنا وغیرہ۔

لفظ رَاعُوْنَ جو اس آیت میں آیا ہے جس کے معنے ہیں رعایت رکھنے والے۔ یہ لفظ عرب کے محاورہ کے موافق اُس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کوئی شخص اپنی قوت اور طاقت کے مطابق

[1] المؤمنون : ۱۵ [2] المؤمنون: ۹

کسی امر کی باریک راہ پر چلنا اختیار کرتا ہے اور اس امر کے تمام دقائق بجالانا چاہتا ہے اور کوئی پہلو اس کا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ پس اس آیت کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ وہ مومن جو وجودِ روحانی کے پنجم درجہ پر ہیں حتی الوسع اپنی موجودہ طاقت کے موافق تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارتے ہیں اور کوئی پہلو تقویٰ کا جو امانتوں یا عہد کے متعلق ہے خالی چھوڑنا نہیں چاہتے اور سب کی رعایت رکھنا اُن کا ملحوظِ نظر ہوتا ہے اور اس بات پر خوش نہیں ہوتے کہ موٹے طور پر اپنے تئیں امین اور صادق العہد قرار دے دیں بلکہ ڈرتے رہتے ہیں کہ در پردہ اُن سے کوئی خیانت ظہور پذیر نہ ہو۔ پس طاقت کے موافق اپنے تمام معاملات میں توجہ سے غور کرتے رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ اندرونی طور پر اُن میں کوئی نقص اور خرابی ہو اور اسی رعایت کا نام دوسرے لفظوں میں **تقویٰ** ہے۔

﴿۵۱﴾ خلاصہ مطلب یہ کہ وہ مومن جو وجود روحانی میں پنجم درجہ پر ہیں وہ اپنے معاملات میں خواہ خدا کے ساتھ ہیں خواہ مخلوق کے ساتھ بے قید اور خلیع الرسن نہیں ہوتے بلکہ اس خوف سے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کسی اعتراض کے نیچے نہ آجاویں اپنی امانتوں اور عہدوں میں دور دور کا خیال رکھ لیتے ہیں اور ہمیشہ اپنی امانتوں اور عہدوں کی پڑتال کرتے رہتے ہیں اور تقویٰ کی دوربین سے اس کی اندرونی کیفیت کو دیکھتے رہتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ در پردہ اُن کی امانتوں اور عہدوں میں کچھ فتور ہو اور جو امانتیں خدا تعالیٰ کی اُن کے پاس ہیں جیسے تمام قویٰ اور تمام اعضاء اور جان اور مال اور عزت وغیرہ ان کو حتی الوسع اپنی پابندی تقویٰ بہت احتیاط سے اپنے اپنے محل پر استعمال کرتے رہتے ہیں اور جو عہد ایمان لانے کے وقت خدا تعالیٰ سے کیا ہے کمال صدق سے حتی المقدور اس کے پورا کرنے کے لئے کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسا ہی جو امانتیں مخلوق کی اُن کے پاس ہوں یا ایسی چیزیں جو امانتوں کے حکم میں ہوں اُن سب میں تا بمقدور تقویٰ کی پابندی سے کاربند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی تنازع واقع ہو تو تقویٰ کو مدّنظر رکھ کر اس کا فیصلہ کرتے ہیں گو اس فیصلہ میں نقصان اٹھالیں۔ یہ درجہ چوتھے درجہ سے اس لئے بڑھ کر ہے

کہ اس میں حتی الوسع تمام اعمال میں تقویٰ کی باریک راہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور حتی الوسع جمیع امور میں ہر ایک قدم تقویٰ کی رعایت سے اٹھانا پڑتا ہے مگر چوتھا درجہ صرف ایک ہی موٹی بات ہے اور وہ یہ کہ زنا سے اور بدکاریوں سے پرہیز کرنا اور ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ زنا ایک بہت بے حیائی کا کام ہے اور اس کا مرتکب شہواتِ نفس سے اندھا ہو کر ایسا ناپاک کام کرتا ہے جو انسانی نسل کے حلال سِلسلہ میں حرام کو ملا دیتا ہے اور تضیع نسل کا موجب ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے شریعت نے اس کو ایسا بھاری گناہ قرار دیا ہے کہ اِسی دنیا میں ایسے انسان کے لئے حدِ شرعی مقرر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ مومن کی تکمیل کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ زنا سے پرہیز کرے کیونکہ زنا نہایت درجہ مفسد طبع اور بے حیا انسانوں کا کام ہے اور یہ ایک ایسا موٹا گناہ ہے جو جاہل سے جاہل اس کو بُرا سمجھتا ہے اور اس پر بجز کسی بے ایمان کے کوئی بھی دلیری نہیں کر سکتا۔ پس اِس کا ترک کرنا ایک معمولی شرافت ہے کوئی بڑے کمال کی بات نہیں لیکن انسان کی تمام روحانی خوبصورتی تقویٰ کی تمام باریک راہوں پر قدم مارنا ہے☆ تقویٰ کی باریک راہیں روحانی خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خط و خال ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی ﴿۵۲﴾ امانتوں اور ایمانی عہدوں✿ کی حتی الوسع رعایت کرنا اور سر سے پیر تک جتنے قویٰ اور اعضاء ہیں

☆ ایمان کے لئے خشوع کی حالت مثل بیج کے ہے اور پھر لغو باتوں کے چھوڑنے سے ایمان اپنا نرم نرم سبزہ نکالتا ہے اور پھر اپنا مال بطور زکوۃ دینے سے ایمانی درخت کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں جو اس کو کسی قدر مضبوط کرتی ہیں اور پھر شہواتِ نفسانیہ کا مقابلہ کرنے سے ان ٹہنیوں میں خوب مضبوطی اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اپنے عہد اور امانتوں کی تمام شاخوں کی محافظت کرنے سے درخت ایمان کا اپنے مضبوط تنہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر پھل لانے کے وقت ایک اور طاقت کا فیضان اس پر ہوتا ہے کیونکہ اس طاقت سے پہلے نہ درخت کو پھل لگ سکتا ہے نہ پھول۔ وہی طاقت روحانی پیدائش کے مرتبہ ششم میں خلق آخر کہلاتی ہے اور اسی مرتبہ ششم پر انسانی کمالات کے پھل اور پھول ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں اور انسانی درخت کی روحانی شاخیں نہ صرف مکمل ہو جاتی ہیں بلکہ اپنے پھل بھی دیتی ہیں۔ منہ

✿ ایمانی عہدوں سے مراد وہ عہد ہیں جو انسان بیعت اور ایمان لانے کے وقت ان کا اقرار کرتا ہے جیسے یہ کہ وہ خون نہیں کرے گا۔ چوری نہیں کرے گا۔ جھوٹی گواہی نہیں دے گا۔ خدا سے کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا اور اسلام اور پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مرے گا۔ منہ

جن میں ظاہری طور پر آنکھیں اور کان اور ہاتھ اور پیر اور دوسرے اعضاء ہیں اور باطنی طور پر دل اور دوسری قوتیں اور اخلاق ہیں۔ ان کو جہاں تک طاقت ہو ٹھیک ٹھیک محلِ ضرورت پر استعمال کرنا اور ناجائز مواضع سے روکنا اور ان کے پوشیدہ حملوں سے متنبہ رہنا اور اسی کے مقابل پر حقوق عباد کا بھی لحاظ رکھنا یہ وہ طریق ہے جو انسان کی تمام روحانی خوبصورتی اس سے وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو **لباس** کے نام سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰی قرآن شریف کا لفظ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روحانی خوبصورتی اور روحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی الوسع رعایت رکھے یعنی ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تا بمقدور کاربند ہو جائے۔

یہ تو وجودِ روحانی کا پانچواں درجہ ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا پانچواں درجہ وہ ہے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا[1] یعنی پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت مڑھ دیا اور جسمانی بناوٹ کی کسی قدر خوبصورتی دکھلا دی۔ یہ عجیب مطابقت ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ روحانی طور پر تقویٰ کو لباس قرار دیا ہے ایسا ہی **کَسَوْنَا** کا لفظ جو **کسوت** سے نکلا ہے وہ بھی بتلا رہا ہے کہ جو گوشت ہڈیوں پر مڑھا جاتا ہے وہ بھی ایک لباس ہے جو ہڈیوں پر پہنایا جاتا ہے۔ پس یہ دونوں لفظ دلالت کر رہے ہیں کہ جیسی خوبصورتی کا لباس تقویٰ پہناتی ہے ایسا ہی وہ کسوت جو ہڈیوں پر چڑھائی جاتی ہے ہڈیوں کے لئے ایک خوبصورتی کا پیرایہ بخشتی ہے۔ وہاں لباس کا لفظ ہے اور یہاں کسوت کا اور دونوں کے معنے ایک ہیں اور نص قرآنی بآواز بلند پکار رہی ہے کہ دونوں کا مقصد خوبصورتی ہے اور جیسا کہ انسان کی روح پر سے اگر تقویٰ کا لباس اتار دیا جائے تو روحانی بدشکلی اس کی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ گوشت و پوست جو حکیم مطلق نے انسان کی ہڈیوں پر مڑھا ہے اگر ہڈیوں پر سے اتار دیا جائے تو انسان کی جسمانی شکل ﴿۵۳﴾

[1] المؤمنون : ۱۵

نہایت مکروہ نکل آتی ہے مگر اس درجہ پنجم میں خواہ درجہ پنجم وجود جسمانی کا ہے اور خواہ درجہ پنجم وجود روحانی کا ہے کامل خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابھی روح کا اُس پر فیضان نہیں ہوا۔ یہ امر مشہود و محسوس ہے کہ ایک انسان گو کیسا ہی خوبصورت ہو جب وہ مرجاتا ہے اور اُس کی روح اس کے اندر سے نکل جاتی ہے تو ساتھ ہی اس حسن میں بھی فرق آجاتا ہے جو اُس کو قدرتِ قادر نے عطا کیا تھا۔ حالانکہ تمام اعضاء اور تمام نقوش موجود ہوتے ہیں مگر صرف ایک روح کے نکلنے سے انسانی قالب کا گھر ایک ویران اور سنسان سا معلوم ہوتا ہے اور آب و تاب کا نشان نہیں رہتا۔ یہی حالت رُوحانی وجود کے پانچویں درجہ کی ہے کیونکہ یہ امر بھی مشہود و محسوس ہے کہ جب تک کسی مومن میں خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس روح کا فیضان نہ ہو جو وجود رُوحانی کے چھٹے درجہ پر ملتی ہے اور ایک فوق العادت طاقت اور زندگی بخشتی ہے تب تک خدا کی امانتوں کے ادا کرنے اور اُن کے ٹھیک طور پر استعمال کرنے اور صدق کے ساتھ اس کا ایمانی عہد پورا کرنے اور ایسا ہی مخلوق کے حقوق اور عہدوں کے ادا کرنے میں وہ آب و تاب تقویٰ پیدا نہیں ہوتی جس کا حُسن اور خوبی دلوں کو اپنی طرف کھینچے اور جس کی ہر ایک ادا فوق العادت اور اعجاز کے رنگ میں معلوم ہو بلکہ قبل اس روح کے تقویٰ کے ساتھ تکلف اور بناوٹ کی ایک ملونی رہتی ہے کیونکہ اس میں وہ رُوح نہیں ہوتی جو حسن روحانی کی آب و تاب دکھلا سکے اور یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ ایسے مومن کا قدم جو ابھی اس روح سے خالی ہے پورے طور پر نیکی پر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ جیسا کہ ایک ہوا کے دھکا سے مُردہ کا کوئی عضو حرکت کر سکتا ہے اور جب ہوا دور ہو جائے تو پھر مُردہ اپنی حالت پر آجاتا ہے ایسا ہی وجود روحانی کے پنجم درجہ کی حالت ہوتی ہے کیونکہ صرف عارضی طور پر خدا تعالیٰ کی نسیم رحمت اس کو نیک کاموں کی طرف جنبش دیتی رہتی ہے اور اس طرح تقویٰ کے کام اُس سے صادر ہوتے ہیں لیکن ابھی نیکی کی روح اس کے اندر آباد نہیں ہوتی اس لئے وہ حسن معاملہ اس میں پیدا نہیں ہوتا جو اس روح کے داخل ہونے کے بعد اپنا جلوہ دکھلاتا ہے۔ ﴿۵۴﴾

غرض پنجم مرتبہ وجود روحانی کا گو ایک ناقص مرتبہ حسن تقویٰ کا حاصل کر لیتا ہے مگر کمال اس حسن کا وجودِ روحانی کے درجہ ششم پر ہی ظاہر ہوتا ہے جب کہ خدا تعالیٰ کی اپنی محبت ذاتیہ روحانی وجود کے لئے ایک روح کی طرح ہو کر انسان کے دل پر نازل ہوتی اور تمام نقصانوں کا تدارک کرتی ہے اور انسان محض اپنی قوتوں کے ساتھ کبھی کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ روح خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہو۔ جیسا کہ حافظ شیرازی نے فرمایا ہے۔

ما بدان منزلِ عالی نتوانیم رسید ہاں مگر لطف تو چوں پیش نہد گامے چند

پھر درجہ پنجم کے بعد چھٹا درجہ وجود روحانی کا وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اِس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[1] یعنی چھٹے درجہ کے مومن جو پانچویں درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو اپنی نمازوں پر آپ محافظ اور نگہبان ہیں یعنی وہ کسی دوسرے کی تذکیر اور یاد دہانی کے محتاج نہیں رہے بلکہ کچھ ایسا تعلق ان کو خدا سے پیدا ہو گیا ہے اور خدا کی یاد کچھ اس قسم کی محبوب طبع اور مدارِ آرام اور مدارِ زندگی ان کے لئے ہو گئی ہے کہ وہ ہر وقت اس کی نگہبانی میں لگے رہتے ہیں اور ہر دم ان کا یادِ الٰہی میں گذرتا ہے اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی خدا کے ذکر سے الگ ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ انسان اسی چیز کی محافظت اور نگہبانی میں تمام تر کوشش کر کے ہر دم لگا رہتا ہے جس کے گم ہونے میں اپنی ہلاکت اور تباہی دیکھتا ہے جیسا کہ ایک مسافر جو ایک بیابان بے آب و دانہ میں سفر کر رہا ہے جس کے صدہا کوس تک پانی اور روٹی ملنے کی کوئی امید نہیں وہ اپنے پانی اور روٹی کی جو ساتھ رکھتا ہے بہت محافظت کرتا ہے اور اپنی جان کے برابر اس کو سمجھتا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ضائع ہونے میں اس کی موت ہے۔ پس وہ لوگ جو اُس مسافر کی طرح اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں اور گو مال کا نقصان ہو یا عزت کا نقصان ہو یا نماز کی وجہ سے کوئی ناراض ہو جائے نماز کو نہیں چھوڑتے اور اس کے ضائع ہونے کے اندیشہ میں سخت بے تاب ہوتے اور پیچ و تاب کھاتے گویا مر ہی جاتے ہیں اور نہیں چاہتے

[1] المؤمنون : ۱۰

﴿۵۵﴾ کہ ایک دم بھی یادِ الٰہی سے الگ ہوں۔ وہ درحقیقت نماز اور یاد الٰہی کو اپنی ایک ضروری غذا سمجھتے ہیں جس پر ان کی زندگی کا مدار ہے اور یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اُن سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبت ذاتیہ کا ایک افروختہ شعلہ جس کو روحانی وجود کے لئے ایک روح کہنا چاہیے اُن کے دل پر نازل ہوتا ہے اور ان کو حیاتِ ثانی بخش دیتا ہے اور وہ روح ان کے تمام وجود روحانی کو روشنی اور زندگی بخشتی ہے۔ تب وہ نہ کسی تکلف اور بناوٹ سے خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں بلکہ وہ خدا جس نے جسمانی طور پر انسان کی زندگی روٹی اور پانی پر موقوف رکھی ہے وہ ان کی روحانی زندگی کو جس سے وہ پیار کرتے ہیں اپنی یاد کی غذا سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ اس روٹی اور پانی کو جسمانی روٹی اور پانی سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اور اس کے ضائع ہونے سے ڈرتے ہیں اور یہ اس روح کا اثر ہوتا ہے جو ایک شعلہ کی طرح اُن میں ڈالی جاتی ہے۔ جس سے عشقِ الٰہی کی کامل مستی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وہ یاد الٰہی سے ایک دم الگ ہونا نہیں چاہتے۔ وہ اس کے لئے دکھ اُٹھاتے اور مصائب دیکھتے ہیں مگر اس سے ایک لحظہ بھی جدا ہونا نہیں چاہتے اور پاس انفاس کرتے ہیں۔ اور اپنی نمازوں کے محافظ اور نگہبان رہتے ہیں۔ اور یہ اَمر اُن کے لئے طبعی ہے کیونکہ درحقیقت خدا نے اپنی محبت سے بھری ہوئی یاد کو جس کو دوسرے لفظوں میں نماز کہتے ہیں ان کے لئے ایک ضروری غذا مقرر کر دیا ہے اور اپنی محبت ذاتیہ سے اُن پر تجلی فرما کر یاد الٰہی کی ایک دلکش لذت ان کو عطا کی ہے۔ پس اس وجہ سے یاد الٰہی جان کی طرح بلکہ جان سے بڑھ کر ان کو عزیز ہو گئی ہے اور خدا کی ذاتی محبت ایک نئی روح ہے جو شعلہ کی طرح ان کے دلوں پر پڑتی اور ان کی نماز اور یادِ الٰہی کو ایک غذا کی طرح ان کے لئے بنا دیتی ہے۔ پس وہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی روٹی اور پانی سے نہیں بلکہ نماز اور یاد الٰہی سے جیتے ہیں۔

غرض محبت سے بھری ہوئی یاد الٰہی جس کا نام نماز ہے وہ درحقیقت ان کی غذا ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتے اور جس کی محافظت اور نگہبانی بعینہٖ اس مسافر کی طرح وہ کرتے

رہتے ہیں جو ایک دشت بے آب و دانہ میں اپنی چند روٹیوں کی محافظت کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور اپنے کسی قدر پانی کو جان کے ساتھ رکھتا ہے جو اس کی مشک میں ہے۔ ﴿۵۶﴾ واہب مطلق نے انسان کی روحانی ترقیات کے لئے یہ بھی ایک مرتبہ رکھا ہوا ہے جو محبت ذاتی اور عشق کے غلبہ اور استیلا کا آخری مرتبہ ہے اور درحقیقت اس مرتبہ پر انسان کے لئے محبت سے بھری ہوئی یاد الٰہی جس کا شرعی اصطلاح میں نماز نام ہے غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے بلکہ وہ بار بار جسمانی روح کو بھی اس غذا پر فدا کرنا چاہتا ہے وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسا کہ مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی اور خدا سے علیحدہ ایک دم بھی بسر کرنا اپنی موت سمجھتا ہے۔ اور اس کی روح آستانہ الٰہی پر ہر وقت سجدہ میں رہتی ہے اور تمام آرام اُس کا خدا ہی میں ہو جاتا ہے اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ مَیں اگر ایک طرفۃ العین بھی یاد الٰہی سے الگ ہوا تو بس میں مرا۔ اور جس طرح روٹی سے جسم میں تازگی اور آنکھ اور کان وغیرہ اعضاء کی قوتوں میں توانائی آجاتی ہے۔ اِسی طرح اس مرتبہ پر یاد الٰہی جو عشق اور محبت کے جوش سے ہوتی ہے مومن کی روحانی قوتوں کو ترقی دیتی ہے یعنی آنکھ میں قوتِ کشف نہایت صاف اور لطیف طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور کان خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنتے ہیں اور زبان پر وہ کلام نہایت لذیذ اور اجلیٰ اور اصفیٰ طور پر جاری ہو جاتا ہے اور رؤیاءِ صادقہ بکثرت ہوتے ہیں۔☆

☆ بہت سے نادان اس وہم میں گرفتار ہیں کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خواب آجاتی ہے یا سچا الہام ہو جاتا ہے تو ہم میں اور ایسے اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں میں فرق کیا ہوا اور ان عالی مرتبہ لوگوں کی کیا خصوصیت باقی رہی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قدر طاقت خواب دیکھنے یا الہام کی اس غرض سے عام لوگوں کی فطرت میں رکھی گئی ہے کہ تا ان کے پاس بھی ان باریک باتوں کا کسی قدر نمونہ ہو جو اس جہان سے وراء الوراء باتیں ہیں۔ اور اس طرح پر وہ اپنے پاس ایک نمونہ دیکھ کر دولتِ قبول سے محروم نہ رہیں اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ ورنہ اگر انسانوں کی یہ حالت ہوتی کہ وحی اور رؤیا صادقہ کی حقیقت سے وہ بالکل بے خبر ہوتے تو بجز انکار کے کیا کر سکتے تھے اور اس حالت میں کسی قدر معذور تھے۔ پھر جبکہ باوجود موجود ہونے اس نمونے کے زمانہ حال کے فلسفی اب تک وحی اور رؤیا صادقہ کا انکار

جوفلق صبح کی طرح ظہور میں آجاتے ہیں اور بباعث علاقہ صافیہ محبت جو حضرت عزت سے ہوتا ہے مبشر خوابوں سے بہت سا حصہ اُن کو ملتا ہے۔ یہی وہ مرتبہ ہے جس مرتبہ پر مومن کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی محبت اس کے لئے روٹی اور پانی کا کام دیتی ہے۔ یہ نئی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب پہلے روحانی قالب تمام تیار ہو چکتا ہے۔ اور پھر وہ روح جو محبت ذاتیہ الٰہیہ کا ایک شعلہ ہے ایسے مومن کے دل پر آپڑتا ہے اور یک دفعہ طاقت بالا نشیمن بشریت سے بلند تر اُس کو لے جاتی ہے۔ اور یہ مرتبہ وہ ہے جس کو روحانی طور پر **خلق آخر** کہتے ہیں۔ اس مرتبہ پر خدا تعالیٰ اپنی ذاتی محبت کا ایک افروختہ شعلہ جس کو دوسرے لفظوں میں **روح** کہتے ہیں مومن کے دل پر نازل کرتا ہے اور اس سے تمام تاریکیوں اور آلائشوں اور کمزوریوں کو دور کر دیتا ہے۔ اور اس روح کے پھونکنے کے ساتھ ہی وہ حسن جو ادنیٰ مرتبہ پر تھا کمال کو پہنچ جاتا ہے اور ایک روحانی آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے اور گندی زندگی کی کبودگی بکلی دور ہو جاتی ہے اور مومن اپنے اندر محسوس کر لیتا ہے کہ ایک نئی روح اس کے اندر داخل ہو گئی ہے جو پہلے نہیں تھی۔ اُس روح کے ملنے سے ایک عجیب سکینت اور اطمینان مومن کو حاصل ہو جاتی ہے اور محبت ذاتیہ ایک فوارہ کی طرح جوش مارتی اور عبودیت کے پودہ کی آبپاشی کرتی ہے اور وہ آگ جو پہلے ایک معمولی گرمی کی حد تک تھی اس درجہ پر وہ تمام و کمال افروختہ ہو جاتی ہے اور انسانی وجود کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر الوہیت کا قبضہ اس پر کر دیتی ہے۔ اور وہ آگ تمام اعضاء پر احاطہ کر لیتی ہے۔ تب اُس لوہے کی مانند جو نہایت درجہ آگ میں ﴿۵۷﴾

کرتے ہیں تو اس وقت عام لوگوں کا کیا حال ہوتا جب کہ ان کے پاس کوئی بھی نمونہ نہ ہوتا۔ اور یہ خیال کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خوابیں آجاتی ہیں یا کوئی سچے الہام ہو جاتے ہیں اس سے رسولوں اور نبیوں کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ ایسے لوگوں کے رؤیا اور الہام شکوک اور شبہات کے دُخان سے خالی نہیں ہوتے اور باایں ہمہ مقدار میں بھی کم ہوتے ہیں۔ پس جیسا کہ ایک مفلس ایک پیسہ کے ساتھ ایک بادشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس بھی مال ہے اور اس کے پاس بھی ایسا ہی یہ مقابلہ بھی ہیچ اور سراسر حماقت ہے۔ منہ

تپایا جائے یہاں تک کہ سرخ ہو جائے اور آگ کے رنگ پر ہو جائے۔ اس مومن سے اُلوہیت کے آثار اور افعال ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ لوہا بھی اس درجہ پر آگ کے آثار اور افعال ظاہر کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ وہ مومن خدا ہو گیا ہے بلکہ محبت الٰہیہ کا کچھ ایسا ہی خاصہ ہے جو اپنے رنگ میں ظاہر وجود کو لے آتی ہے اور باطن میں عبودیت اور اس کا ضعف موجود ہوتا ہے۔ اس درجہ پر مومن کی روٹی خدا ہوتا ہے جس کے کھانے پر اس کی زندگی موقوف ہے اور مومن کا پانی بھی خدا ہوتا ہے جس کے پینے سے وہ موت سے بچ جاتا ہے۔ اور اس کی ٹھنڈی ہوا بھی خدا ہی ہوتا ہے جس سے اس کے دل کو راحت پہنچتی ہے۔ اور اس مقام پر استعارہ کے رنگ میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خدا اس مرتبہ کے مومن کے اندر داخل ہوتا اور اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا اور اس کے دل کو اپنا تخت گاہ بنا لیتا ہے۔ تب وہ اپنی روح سے نہیں بلکہ خدا کی روح سے دیکھتا اور خدا کی روح سے سنتا اور خدا کی روح سے بولتا اور خدا کی روح سے چلتا اور خدا کی روح سے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس مرتبہ پر نیستی اور استہلاک کے مقام میں ہوتا ہے اور خدا کی روح اس پر اپنی محبت ذاتیہ کے ساتھ تجلی فرما کر حیات ثانی اس کو بخشتی ہے۔ پس اس وقت روحانی طور پر اس پر یہ آیت صادق آتی ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[1] ﴿۵۸﴾

یہ تو وجود روحانی کا مرتبہ ششم ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی پیدائش کا مرتبہ ششم ہے اور اس جسمانی مرتبہ کے لئے بھی وہی آیت ہے جو روحانی مرتبہ کے لئے اوپر ذکر ہو چکی ہے یعنی ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب ہم ایک پیدائش کو طیار کر چکے تو بعد اس کے ہم نے ایک اور پیدائش سے انسان کو پیدا کیا۔ اَور کے لفظ سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ وہ ایسی فوق الفہم پیدائش ہے جس کا سمجھنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے اور اُس کے فہم سے بہت دور یعنی روح جو قالب کی

[1] المؤمنون : ۱۵

طیاری کے بعد جسم میں ڈالی جاتی ہے وہ ہم نے انسان میں روحانی اور جسمانی دونوں طور پر ڈال دی جو مجہول الکنہ ہے اور جس کی نسبت تمام فلسفی اور اس مادی دنیا کے تمام مقلد حیران ہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ اور جب کہ حقیقت تک اُن کو راہ نہ ملی تو اپنی اٹکل سے ہر ایک نے تُکیں لگائیں۔ کسی نے روح کے وجود سے ہی انکار کیا۔ اور کسی نے اس کو قدیم اور غیر مخلوق سمجھا۔ پس اللہ تعالیٰ اس جگہ فرماتا ہے کہ ''روح'' بھی خدا کی پیدائش ہے مگر دنیا کے فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ اس دنیا کے فلاسفر اس روح سے بے خبر ہیں جو وجود جسمانی کے چھٹے مرتبہ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جسم پر فائض ہوتی ہے ویسا ہی وہ لوگ اس روح سے بھی بے علم رہے کہ جو وجود روحانی کے چھٹے مرتبہ پر مومن صادق کو خدا تعالیٰ سے ملتی ہے اور اس بارے میں بھی مختلف راہیں اختیار کیں۔ بہتوں نے ایسے لوگوں کی پوجا شروع کر دی جن کو وہ روح بھی دی گئی تھی اور ان کو قدیم اور غیر مخلوق اور خدا سمجھ لیا اور بہتوں نے اس سے انکار کر دیا کہ اس مرتبہ کے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ایسی روح بھی انسان کو ملتی ہے۔

﴿۵۹﴾ لیکن اس بات کو بہت جلد ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جب کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خدا نے زمین کے تمام پرند و چرند پر اس کو بزرگی دے کر اور سب پر حکومت بخش کر اور عقل و فہم عنایت فرما کر اور اپنی معرفت کی ایک پیاس لگا کر اپنے ان تمام افعال سے جتلا دیا ہے کہ انسان خدا کی محبت اور عشق کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جائے کہ انسان محبتِ ذاتیہ کے مقام تک پہنچ کر اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کی محبت پر خدا کی محبت ایک روح کی طرح وارد ہو کر تمام کمزوریاں اس کی دُور کر دے۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وجود روحانی کے ششم مرتبہ کے بارے میں فرمایا ہے۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[1] ایسا ہی دائمی حضور اور سوز و گداز اور عبودیت انسان سے سرزد ہو اور اس طرح پر وہ اپنے وجود کی علت غائی کو پورا کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[2] یعنی مَیں نے پرستش کے لئے ہی

[1] المؤمنون: ۱۰ [2] الذّٰریٰت: ۵۷

جِنّ و اِنس کو پیدا کیا ہے۔ ہاں یہ پرستش اور حضرت عزّت کے سامنے دائمی حضور کے ساتھ کھڑا ہونا بجز محبت ذاتیہ کے ممکن نہیں۔ اور محبت سے مراد یک طرفہ محبت نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کی دونوں محبتیں مراد ہیں تا بجلی کی آگ کی طرح جو مرنے والے انسان پر گرتی ہے اور جو اُس وقت اس انسان کے اندر سے نکلتی ہے بشریت کی کمزوریوں کو جلا دیں اور دونوں مل کر تمام روحانی وجود پر قبضہ کر لیں۔

یہی وہ کامل صورت ہے جس میں انسان ان امانتوں اور عہد کو جن کا ذکر وجود روحانی کے مرتبہ پنجم میں تحریر ہے کامل طور پر اپنے اپنے موقع پر ادا کر سکتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مرتبہ پنجم میں انسان صرف تقویٰ کے لحاظ سے خدا اور مخلوق کی امانتوں اور عہد کا لحاظ رکھتا ہے اور اس مرتبہ پر محبت ذاتی کے تقاضا سے جو خدا کے ساتھ اس کو ہو گئی ہے جس کی وجہ سے خدا کی مخلوق کی محبت بھی اُس میں جوش زن ہو گئی ہے اور اس روح کے تقاضا سے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر نازل ہوتی ہے ان تمام حقوق کو طبعاً بوجہ احسن ادا کرتا ہے اور اس صورت میں وہ حسن باطنی جو حسنِ ظاہری کے مقابل پر ہے بوجہ احسن اس کو نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ وجود روحانی کے مرتبہ پنجم میں تو ابھی وہ روح انسان میں داخل نہیں ہوئی تھی جو محبت ذاتیہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے جلوۂ حُسن بھی ابھی کمال پر نہیں تھا مگر روح کے داخل ہونے کے بعد وہ حسن کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مُردہ خوبصورت اور زندہ خوبصورت یکساں آب و تاب نہیں رکھتے۔ ﴿۶۰﴾

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انسان کی پیدائش میں دو قسم کے حسن ہیں۔ ایک حسن معاملہ اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی تمام امانتوں اور عہد کے ادا کرنے میں یہ رعایت رکھے کہ کوئی امر حتی الوسع اُن کے متعلق فوت نہ ہو۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں رَاعُـــون کا لفظ اِسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایسا ہی لازم ہے کہ انسان مخلوق کی امانتوں اور عہد کی نسبت بھی یہی لحاظ رکھے یعنی حقوق اللہ اور حقوق عباد میں تقویٰ سے کام لے۔ یہ حسن معاملہ ہے یا یوں کہو کہ روحانی خوبصورتی ہے جو درجہ پنجم وجود روحانی میں نمایاں ہوتی ہے مگر

ہنوز پورے طور پر چمکتی نہیں اور وجود روحانی کے درجہ ششم میں بوجہ کامل ہونے پیدائش اور روح کے داخل ہوجانے کے یہ خوبصورتی اپنی تمام آب وتاب دکھلا دیتی ہے۔اور یاد رہے کہ مرتبہ ششم وجود روحانی میں روح سے مراد وہ محبت ذاتیہ الٰہیہ ہے جو انسان کی محبت ذاتیہ پر ایک شعلہ کی طرح پڑتی اور تمام اندرونی تاریکی دور کرتی اور روحانی زندگی بخشتی ہے اور اس کے لوازم میں سے روح القدس کی تائید بھی کامل طور پر ہے۔

دوسرا[۲] حُسن انسان کی پیدائش میں حسن بشرہ ہے۔اور یہ دونوں حسن اگرچہ روحانی اور جسمانی پیدائش درجہ پنجم میں نمودار ہوجاتے ہیں لیکن آب وتاب اُن کی فیضانِ روح کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ جسمانی وجود کی روح جسمانی قالب طیار ہونے کے بعد جسم میں داخل ہوتی ہے ایسا ہی روحانی وجود کی روح روحانی قالب طیار ہونے کے بعد انسان کے رُوحانی وجود میں داخل ہوتی ہے۔یعنی اُس وقت جب کہ انسان شریعت کا تمام جُوا اپنی گردن پر لے لیتا ہے اور مشقت اور مجاہدہ کے ساتھ تمام حدودِ الٰہیہ کے قبول کرنے کے لئے طیار ہوتا ہے اور ورزش شریعت اور بجا آوری احکامِ کتاب اللہ سے اس لائق ہو جاتا ہے کہ خدا کی روحانیت اس کی طرف توجہ فرماوے اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنی محبت ذاتیہ سے اپنے تئیں خدا تعالیٰ کی محبت ذاتیہ کا مستحق ٹھہرالیتا ہے جو برف کی طرح سفید اور شہد کی طرح شیریں ہے۔اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وجود روحانی خشوع کی حالت سے شروع ہوتا ہے اور روحانی نشوونما کے چھٹے[۶] مرتبہ پر یعنی اس مرتبہ پر کہ جب کہ روحانی قالب کے کامل ہونے کے بعد محبت ذاتیہ الٰہیہ کا شعلہ انسان کے دل پر ایک روح کی طرح پڑتا ہے اور دائمی حضور کی حالت اس کو بخش دیتا ہے کمال کو پہنچتا ہے اور تبھی روحانی حسن اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے لیکن یہ حسن جو روحانی حسن ہے جس کو حسن معاملہ کے ساتھ موسوم کرسکتے ہیں یہ وہ حسن ہے جو اپنی قوی کششوں کے ساتھ حسن بشرہ سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ حسن بشرہ صرف ایک یا دو شخص کے فانی عشق کا موجب ہوگا جو جلد ﴿۶۱﴾

زوال پذیر ہو جائے گا اور اس کی کشش نہایت کمزور ہوگی لیکن وہ روحانی حسن جس کو حسن معاملہ سے موسوم کیا گیا ہے وہ اپنی کششوں میں ایسا سخت اور زبردست ہے کہ ایک دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور زمین و آسمان کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے اور قبولیت دعا کی بھی درحقیقت فلاسفی یہی ہے کہ جب ایسا روحانی حسن والا انسان جس میں محبت الٰہیہ کی روح داخل ہو جاتی ہے جب کسی غیر ممکن اور نہایت مشکل امر کے لئے دعا کرتا ہے اور اُس دعا پر پورا پورا زور دیتا ہے تو چونکہ وہ اپنی ذات میں حسن روحانی رکھتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے امر اور اذن سے اس عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ پس ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی کامیابی کے لئے کافی ہوں۔ تجربہ اور خدا تعالیٰ کی پاک کتاب سے ثابت ہے کہ دنیا کے ہر ایک ذرّہ کو طبعًا ایسے شخص کے ساتھ ایک عشق ہوتا ہے اور اُس کی دعائیں اُن تمام ذرّات کو ایسا اپنی طرف کھینچتی ہیں جیسا کہ آہن رُبا لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پس غیر معمولی باتیں جن کا ذکر کسی علمِ طبعی اور فلسفہ میں نہیں اس کشش کے باعث ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کشش طبعی ہوتی ہے۔ جب سے کہ صانع مطلق نے عالمِ اجسام کو ذرّات سے ترکیب دی ہے ہر ایک ذرّے میں وہ کشش رکھی ہے اور ہر ایک ذرّہ روحانی حسن کا عاشق صادق ہے اور ایسا ہی ہر ایک سعید روح بھی کیونکہ وہ حسن تجلّی گاہِ حق ہے۔ وہی حسن تھا جس کے لئے فرمایا گیا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ[1] اور اب بھی بہتیرے ابلیس ہیں جو اِس حسن کو شناخت نہیں کرتے مگر وہ حسن بڑے بڑے کام دکھلاتا رہا ہے۔ ﴿۶۲﴾

نوح میں وہی حسن تھا جس کی پاس خاطر حضرت عزت جلّ شانہٗ کو منظور ہوئی اور تمام منکروں کو پانی کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد **موسیٰ** بھی وہی حسن روحانی لے کر آیا جس نے چند روز تکلیفیں اٹھا کر آخر فرعون کا بیڑا غرق کیا۔ پھر سب کے بعد سیّد الانبیاء و خیر الوریٰ مولانا و سیدنا **حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم** ایک عظیم الشان روحانی حسن لے کر آئے جس کی تعریف میں یہی آیت کریمہ کافی ہے۔ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[2] یعنی وہ

[1] البقرۃ: ۳۵ [2] النجم: ۹، ۱۰

نبی جنابِ الٰہی سے بہت نزدیک چلا گیا۔ اور پھر مخلوق کی طرف جھکا اور اس طرح پر دونوں حقوں کو جو **حق اللہ** اور **حق العباد** ہے ادا کر دیا۔ اور دونوں قسم کا حسن روحانی ظاہر کیا۔ اور دونوں قوسوں میں وتر کی طرح ہو گیا۔ یعنی دونوں قوسوں میں جو ایک درمیانی خط کی طرح ہو اور اس طرح اس کا وجود واقع ہوا جیسے یہ۔

اس حسن کو ناپاک طبع اور اندھے لوگوں نے نہ دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ[1] یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تو انہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے۔

اس جگہ بعض جاہل کہتے ہیں کہ کیوں کامل لوگوں کی بعض دُعائیں منظور نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی تجلی حسن کو خدا تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے۔ پس جس جگہ یہ تجلی عظیم ظاہر ہو جاتی ہے اور کسی معاملہ میں اُن کا **حسن** جوش میں آتا ہے اور اپنی چمک دکھلاتا ہے تب اس چمک کی طرف ذرّاتِ عالم کھنچے جاتے ہیں اور غیر ممکن باتیں وقوع میں آتی ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں معجزہ کہتے ہیں مگر یہ جوشِ روحانی ہمیشہ اور ہر جگہ ظہور میں نہیں آتا اور تحریکات خارجیہ کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ جیسا کہ خدائے کریم بے نیاز ہے اس نے اپنے برگزیدوں میں بھی بے نیازی کی صفت رکھ دی ہے۔ سو وہ خدا کی طرح سخت بے نیاز ہوتے ہیں اور جب تک کوئی پوری خاکساری اور اخلاص کے ساتھ اُن کے رحم کے لئے ایک تحریک پیدا نہ کرے وہ قوت اُن کی جوش نہیں مارتی اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ تمام دنیا سے زیادہ تر رحم کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں مگر اُس کی تحریک اُن کے اختیار میں نہیں ہوتی گو وہ بارہا چاہتے بھی ہیں کہ وہ قوت ظہور میں آوے مگر بجز ارادہ الٰہیہ کے ظاہر نہیں ہوتی۔ بالخصوص وہ منکروں اور منافقوں اور ﴿۶۳﴾

[1] الاعراف:۱۹۹

سُست اعتقاد لوگوں کی کچھ بھی پروا نہیں رکھتے اور ایک مرے ہوئے کیڑے کی طرح اُن کو سمجھتے ہیں اور وہ بے نیازی ان کی ایک ایسی شان رکھتی ہے جیسا کہ ایک معشوق نہایت خوبصورت برقع میں اپنا چہرہ چھپائے رکھے۔ اور اِسی بے نیازی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب کوئی شریر انسان اُن پر بدظنی کرے تو بسا اوقات بے نیازی کے جوش سے اُس بدظنی کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ کیونکہ تخلّق باخلاق اللّٰہ رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا[1] جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ اُن سے ظاہر ہو تو اُن کے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے اور ایک امر کے حصول کے لئے سخت کرب اور قلق اُن کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تب وہ بے نیازی کا برقع اپنے منہ پر سے اتار لیتے ہیں اور وہ حسن اُن کا جو بجز خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں دیکھتا وہ آسمان کے فرشتوں پر اور ذرّہ ذرّہ پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اُن کا منہ پر سے برقع اٹھانا یہ ہے کہ وہ اپنے کامل صدق اور صفا کے ساتھ اور اِس روحانی حسن کے ساتھ جس کی وجہ سے وہ خدا کے محبوب ہو گئے ہیں اس خدا کی طرف ایک ایسا خارق عادت رجوع کرتے ہیں اور ایک ایسے اقبال علی اللہ کی اُن میں حالت پیدا ہو جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی فوق العادت رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ساتھ ہی ذرّہ ذرّہ اس عالم کا کھنچا چلا آتا ہے۔ اور اُن کی عاشقانہ حرارت کی گرمی آسمان پر جمع ہوتی اور بادلوں کی طرح فرشتوں کو بھی اپنا چہرہ دکھا دیتی ہے اور اُن کی دردیں جو رعد کی خاصیت اپنے اندر رکھتی ہیں ایک سخت شور ملاءِ اعلیٰ میں ڈال دیتی ہیں تب خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ بادل پیدا ہو جاتے ہیں جن سے رحمتِ الٰہی کا وہ مینہ برستا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اُن کی روحانیت جب اپنے پورے سوز و گداز کے ساتھ کسی عقدہ کشائی کے لئے توجہ کرتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے کیونکہ وہ لوگ بباعث اس کے جو خدا سے ذاتی محبت رکھتے ہیں محبوبانِ الٰہی میں داخل ہوتے ہیں۔ تب ہر ایک چیز جو خدا تعالیٰ کے

[1] البقرة:۱۱

زیرِ حکم ہے۔اُن کی مدد کے لئے جوش مارتی ہے ☆ اور رحمتِ الٰہی محض اُن کی مراد پوری کرنے کے لئے ایک خلق جدید کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔اور وہ امور ظاہر ہوتے ہیں جو اہل دنیا کی نظر ﴿۶۴﴾ میں غیر ممکن معلوم ہوتے ہیں اور جن سے سفلی علوم محض نا آشنا ہیں۔ایسے لوگوں کو خدا تو نہیں کہہ سکتے مگر قرب اور علاقہ محبت اُن کا کچھ ایسا صدق اور صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے گویا خدا اُن میں اُتر آتا ہے۔اور آدم کی طرح خدائی روح اُن میں پھونکی جاتی ہے مگر یہ نہیں کہ وہ خدا ہیں لیکن درمیان میں کچھ ایسا تعلق ہے جیسا کہ لوہے کو جب کہ سخت طور پر آگ سے افروختہ ہو جائے اور آگ کا رنگ اُس میں پیدا ہو جائے آگ سے تعلق ہوتا ہے۔اس صورت میں تمام چیزیں جو خدا تعالیٰ کے زیرِ حکم ہیں اُن کے زیرِ حکم ہو جاتی ہیں۔اور آسمان کے ستارے اور سورج اور چاند سے لے کر زمین کے سمندروں اور ہوا اور آگ تک اُن کی آواز کو سُنتے اور ان کو شناخت کرتے اور اُن کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور ہر ایک چیز طبعاً اُن سے پیار کرتی ہے اور عاشقِ صادق کی طرح اُن کی طرف کھنچی جاتی ہے۔بجز شریر انسانوں کے جو شیطان کا اوتار ہیں۔عشق مجازی تو ایک منحوس عشق ہے کہ ایک طرف پیدا ہوتا اور ایک طرف مر جاتا ہے۔ اور نیز اس کی بنا اُس حسن پر ہے جو قابل زوال ہے۔اور نیز اُس حسن کے اثر کے نیچے آنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں مگر یہ کیا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہ حسن روحانی جو حسن معاملہ اور صدق وصفا اور محبتِ الٰہیہ کی تجلی کے بعد انسان میں پیدا ہوتا ہے اس میں ایک عالمگیر کشش پائی جاتی ہے وہ مستعد دلوں کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ جیسے شہد چیونٹیوں کو۔اور نہ صرف انسان بلکہ عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی کشش سے متاثر ہوتا ہے۔صادق المحبت انسان جو سچی محبت خدا تعالیٰ سے رکھتا ہے وہ وہ یوسف ہے جس کے لئے ذرّہ ذرّہ اس عالم کا زلیخا صفت ہے۔اور ابھی حسن اُس کا اس عالم میں ظاہر نہیں کیونکہ یہ عالم اس کی برداشت نہیں کرتا۔خدا تعالیٰ

☆ کافر اور دشمن بھی ایک قسم کی ان کی مدد کرتے ہیں کہ ایذاء اور ظلم کے ساتھ ان کے دل کو دکھ دیتے اور ان کی روحانیت کو جوش میں لاتے ہیں۔ تا دل مرد خدا نامد بدرد ہیچ قومے راخدا رسوا نہ کرد۔ **منہ**

اپنی پاک کتاب میں جو فرقان مجید ہے فرماتا ہے کہ مومنوں کا نور اُن کے چہروں پر دوڑتا ہے۔ اور مومن اس حسن سے شناخت کیا جاتا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں نور ہے۔

اور مجھے ایک دفعہ عالم کشف میں پنجابی زبان میں اِسی علامت کے بارہ میں یہ موزوں فقرہ سنایا گیا۔ ''**عشق الٰہی وَسّے مُنہ پر ولیاں ایہہ نشانی**'' مومن کا نور جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے وہ وہی روحانی حسن و جمال ہے جو مومن کو وجودِ روحانی کے مرتبہ ششم پر کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ جسمانی حسن کا ایک شخص یا دو شخص خریدار ہوتے ہیں مگر یہ عجیب حُسن ہے جس کے خریدار کروڑ ہا رُوحیں ہو جاتی ہیں۔ اِسی روحانی حسن کی بنا پر بعض نے **سید عبدالقادر جیلانی** رضی اللہ عنہٗ☆ کی نعت میں یہ شعر کہے ہیں اور اُن کو ایک نہایت درجہ حسین اور خوبصورت قرار دیا ہے اور وہ اشعار یہ ہیں ؎

آن تُرکِ عجم چون زِ مئے عشق طرب کرد
غارت گریٔ کوفہ و بغداد و حلب کرد
صد لالہ رُخے بود بصد حُسنِ شگفتہ
نازان ہمہ را زِیر قدم کرد عجب کرد

﴿۶۵﴾

☆ فطرتاً بعض طبائع کو بعض طبائع سے مناسبت ہوتی ہے۔ اسی طرح میری روح اور سید عبدالقادر کی روح کو خمیر فطرت سے باہم ایک مناسبت ہے جس پر کشوفِ صحیحہ صریحہ سے مجھ کو اطلاع ملی ہے۔ اس بات پر تیس ۳۰ برس کے قریب زمانہ گزر گیا ہے کہ جب ایک رات مجھے خدا نے اطلاع دی کہ اُس نے مجھے اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔ تب یہ عجیب اتفاق ہوا کہ اُسی رات ایک بڑھیا کو خواب آئی جس کی عمر قریباً اسّی ۸۰ برس کی تھی اور اُس نے صبح مجھ کو آ کر کہا کہ میں نے رات سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا ہے اور ساتھ ان کے ایک اور بزرگ تھے اور دونوں سبز پوش تھے اور رات کے پچھلے حصہ کا وقت تھا۔ دوسرا بزرگ عمر میں اُن سے کچھ چھوٹا تھا۔ پہلے انہوں نے ہماری جامع مسجد میں نماز پڑھی اور پھر مسجد کے باہر کے صحن میں نکل آئے اور میں اُن کے پاس کھڑی تھی اتنے میں مشرق کی طرف سے ایک چمکتا ہوا ستارہ نکلا تب اس ستارہ کو دیکھ کر سید عبدالقادر بہت خوش ہوئے اور ستارہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا السلام علیکم اور ایسا ہی ان کے رفیق نے السلام علیکم کہا۔ اور وہ ستارہ میں تھا۔ المؤمن یَرٰی و یُرٰی لہ۔ **منہ**

اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی اس بارہ میں ایک شعر کہا ہے جو حسن روحانی پر بہت منطبق ہوتا ہے اور وہ یہ ہے

صورت گر دیبائے چین روصورتِ زیباش بین
یا صورتے برکش چنیں یا توبہ کن صورت گری

اب یہ بھی یاد رہے کہ بندہ تو حسن معاملہ دکھلا کر اپنے صدق سے بھری ہوئی محبت ظاہر کرتا ہے مگر خدا تعالیٰ اس کے مقابلہ پر حد ہی کر دیتا ہے اس کی تیز رفتار کے مقابل پر برق کی طرح اس کی طرف دوڑتا چلا آتا ہے اور زمین و آسمان سے اس کے لئے نشان ظاہر کرتا ہے اور اس کے دوستوں کا دوست اور اس کے دشمنوں کا دشمن بن جاتا ہے اور اگر پچاس کروڑ انسان بھی اُس کی مخالفت پر کھڑا ہو تو ان کو ایسا ذلیل اور بے دست و پا کر دیتا ہے جیسا کہ ایک مرا ہوا کیڑا۔ اور محض ایک شخص کی خاطر کے لئے ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے اور اپنی زمین و آسمان کو اس کے خادم بنا دیتا ہے اور اس کے کلام میں برکت ڈال دیتا ہے اور اس کے تمام در و دیوار پر نور کی بارش کرتا ہے اور اُس کی پوشاک میں اور اُس کی خوراک میں اور اس مٹی میں بھی جس پر اس کا قدم پڑتا ہے ایک برکت رکھ دیتا ہے اور اس کو نامراد ہلاک نہیں کرتا۔ اور ہر ایک اعتراض جو اس پر ہو اُس کا آپ جواب دیتا ہے۔ وہ اُس کی آنکھیں ہو جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے اور اُس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور اُس کے پانوں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے اور اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جن سے وہ دشمنوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ اُس کے دشمنوں کے مقابل پر آپ نکلتا ہے اور شریروں پر جو اُس کو دُکھ دیتے ہیں آپ تلوار کھینچتا ہے۔ ہر میدان میں اس کو فتح دیتا ہے اور اپنی قضاء و قدر کے پوشیدہ راز اس کو بتلاتا ہے۔ غرض پہلا خریدار اس کے رُوحانی حسن و جمال کا جو حسن معاملہ اور محبت ذاتیہ کے بعد پیدا ہوتا ہے خدا ہی ہے۔ پس کیا ہی بدقسمت وہ لوگ ہیں جو ایسا زمانہ پاویں اور ایسا سورج اُن پر طلوع کرے اور وہ تاریکی میں بیٹھے رہیں۔ ﴿۶۶﴾

بعض نادان یہ اعتراض بار بار پیش کرتے ہیں کہ محبوبانِ الٰہی کی یہ علامت ہے کہ ہر ایک

دعا اُن کی سنی جاتی ہے اور جس میں یہ علامت نہیں پائی جاتی وہ محبوبانِ الٰہی میں سے نہیں ہے☆ مگر افسوس کہ یہ لوگ منہ سے تو ایک بات نکال لیتے ہیں مگر اعتراض کرنے کے وقت یہ نہیں سوچتے کہ ایسے جاہلانہ اعتراض خدا تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں پر وارد ہوتے ہیں مثلاً ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی کہ تمام کفار ان کے زمانہ کے جو ان کی مخالفت پر کھڑے تھے مسلمان ہو جائیں مگر یہ مراد اُن کی پوری نہ ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ[1] یعنی ''کیا تو اِس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے ایمان لانے کے لئے اس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دُعا کرتے تھے کہ اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے اس قدر غم نہ کر اور اس قدر اپنے دل کو دردوں کا نشانہ مت بنا کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپروا ہیں اور ان کے اغراض اور مقاصد اَور ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اے نبی (علیہ السلام)! جس قدر تو عقد ہمت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی روح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کے لئے دعا کرتا ہے تیری دعاؤں کے پُر تاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن شرط قبولیت دعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے سخت متعصب اور لاپرواا ور گندی فطرت کا انسان نہ ہو ورنہ دعا قبول نہیں ہوگی اور جہاں تک مجھے خدا تعالیٰ نے دعاؤں کے بارے میں علم دیا ہے وہ یہ ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں۔ ﴿۶۷﴾

☆ یاد رہے کہ مومن کے ساتھ خدا تعالیٰ دوستانہ معاملہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کبھی تو وہ مومن کے ارادہ کو پورا کرے اور کبھی مومن اس کے ارادہ پر راضی ہو جائے۔ پس ایک جگہ تو مومن کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[2] یعنی دعا کرو کہ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اس جگہ تو مومن کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ اور دوسری جگہ اپنی خواہش مومن سے منوانا چاہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ[3] افسوس کہ نادان آدمی صرف ایک پہلو کو دیکھتا ہے اور دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتا۔ منہ

[1] الشعراء:۴ [2] المؤمن:۶۱ [3] البقرۃ:۱۵۶، ۱۵۷

اوّل۔ دُعا کرنے والا کامل درجہ پر متقی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا مقبول وہی بندہ ہوتا ہے جس کا شعار تقویٰ ہو اور جس نے تقویٰ کی باریک راہوں کو مضبوط پکڑا ہو اور جو امین اور متقی اور صادق العہد ہونے کی وجہ سے منظورِ نظرِ الٰہی ہو۔ اور محبتِ ذاتیہ الٰہیہ سے معمور اور پُر ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کی عقدِ ہمت اور توجہ اس قدر ہو کہ گویا ایک شخص کے زندہ کرنے کے لئے ہلاک ہو جائے اور ایک شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے آپ گور میں داخل ہو۔ اس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقبول بندے اس سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں جیسا کہ ایک خوبصورت بچہ جو ایک ہی ہو اس کی ماں کو پیارا ہوتا ہے۔ پس جب کہ خدائے کریم و رحیم دیکھتا ہے کہ ایک مقبول و محبوب اُس کا ایک شخص کی جان بچانے کے لئے روحانی مشقتوں اور تضرعات اور مجاہدات کی وجہ سے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ قریب ہے کہ اُس کی جان نکل جائے تو اُس کو علاقۂ محبت کی وجہ سے ناگوار گذرتا ہے کہ اسی حال میں اُس کو ہلاک کر دے۔ تب اس کے لئے اس دوسرے شخص کا گناہ بخش دیتا ہے جس کے لئے وہ پکڑا گیا تھا پس اگر وہ کسی مہلک بیماری میں گرفتار ہے یا اور کسی بلا میں اسیر و لاچار ہے تو اپنی قدرت سے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جس سے رہائی ہو جائے اور بسا اوقات اُس کا ارادہ ایک شخص کے قطعی طور پر ہلاک کرنے یا برباد کرنے پر قرار یافتہ ہوتا ہے لیکن جب ایک مصیبت زدہ کی خوش قسمتی سے ایسا شخص پُر درد تضرعات کے ساتھ درمیان میں آپڑتا ہے جس کو حضرت عزت میں وجاہت ہے تو وہ مثل مقدمہ جو سزا دینے کے لئے مکمل اور مرتب ہو چکی ہے چاک کرنی پڑتی ہے کیونکہ اب بات اغیار سے یار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور یہ کیونکر ہو سکے کہ خدا اپنے سچے دوستوں کو عذاب دے۔

۳۔ **تیسری** شرط **استجابت دُعا** کے لئے ایک ایسی شرط ہے جو تمام شرطوں سے مشکل تر ہے کیونکہ اس کا پورا کرنا خدا کے مقبول بندوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُس شخص کے ہاتھ میں ہے جو دعا کرانا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہایت صدق اور کامل اعتقاد اور کامل یقین اور کامل ارادت اور کامل غلامی کے ساتھ دُعا کا خواہاں ہو اور یہ دل میں فیصلہ کر لے کہ اگر دُعا ﴿۶۸﴾

قبول بھی نہ ہوتا ہم اس کے اعتقاد اور ارادت میں فرق نہیں آئے گا۔ اور دُعا کرانا آزمائش کے طور پر نہ ہو بلکہ سچے اعتقاد کے طور پر ہو اور نہایت نیاز مندی سے اس کے دروازے پر گرے اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے مال سے خدمت سے ہر ایک طور کی اطاعت سے ایسا قرب پیدا کرے کہ اس کے دل کے اندر داخل ہو جائے اور با ایں ہمہ نہایت درجہ پر نیک ظن ہو اور اُس کو نہایت درجہ کا متقی سمجھے اور اس کی مقدس شان کے برخلاف ایک خیال بھی دل میں لانا کفر خیال کرے اور اس قسم کی طرح طرح کی جاں نثاری دکھلا کر سچے اعتقاد کو اُس پر ثابت اور روشن کر دے اور اس کی مثل دنیا میں کسی کو بھی نہ سمجھے اور جان سے مال سے آبرو سے اُس پر فدا ہو جائے۔ اور کوئی کلمہ کسر شان کا کسی پہلو سے اس کی نسبت زبان پر نہ لائے اور نہ دل میں۔ اور اس بات کو اس کی نظر میں بپایۂ ثبوت پہنچا دے کہ درحقیقت وہ ایسا ہی معتقد اور مرید ہے اور با ایں ہمہ صبر سے انتظار کرے اور اگر پچاس دفعہ بھی اپنے کام میں نامراد رہے پھر بھی اعتقاد اور یقین میں سُست نہ ہو۔ کیونکہ یہ قوم سخت نازک دل ہوتی ہے اور اُن کی فراست چہرہ کو دیکھ کر پہچان سکتی ہے کہ یہ شخص کس درجہ کا اخلاص رکھتا ہے اور یہ قوم باوجود نرم دل ہونے کے نہایت بے نیاز ہوتی ہے۔ اُن کے دل خدا نے ایسے بے نیاز پیدا کئے ہیں کہ متکبّر اور خودغرض اور منافق طبع انسان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اس قوم سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اس قدر غلامانہ اطاعت اُن کی اختیار کرتے ہیں کہ گویا مر ہی جاتے ہیں۔ مگر وہ شخص جو قدم قدم پر بدظنی کرتا ہے اور دل میں کوئی اعتراض رکھتا ہے اور پوری محبت اور ارادت نہیں رکھتا وہ بجائے فائدہ کے **ہلاک ہوتا ہے**۔

اب ہم اس تقریر کے بعد کہتے ہیں کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے مومن کے وجود روحانی کے مراتب سِتّہ بیان کر کے ان کے مقابل پر وجودِ جسمانی کے مراتبِ سِتّہ دکھلائے ہیں یہ ایک **علمی معجزہ** ہے اور جس قدر کتابیں دنیا میں کُتب سماوی کہلاتی ہیں یا جن حکیموں نے نفس اور الٰہیات کے بارے میں تحریریں کی ہیں اور یا جن لوگوں نے صوفیوں کی طرز پر معارف ﴿۶۹﴾

کی باتیں لکھی ہیں کسی کا ذہن ان میں سے اس بات کی طرف سبقت نہیں لے گیا کہ یہ مقابلہ جسمانی اور روحانی وجود کا دکھلاتا۔ اگر کوئی شخص میرے اس دعوے سے منکر ہو اور اس کا گمان ہو کہ یہ مقابلہ روحانی اور جسمانی کسی اَور نے بھی دکھلایا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس علمی معجزہ کی نظیر کسی اَور کتاب میں سے پیش کر کے دکھلاوے۔ اور مَیں نے تو توریت اور انجیل اور ہندوؤں کے وید کو بھی دیکھا ہے۔ مگر مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اِس قسم کا علمی معجزہ میں نے بجز قرآن شریف کے کسی کتاب میں نہ پایا۔ اور صرف اِسی معجزہ پر حصر نہیں بلکہ تمام قرآن شریف ایسے ہی علمی معجزات سے پُر ہے جن پر ایک عقل مند نظر ڈال کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ اُسی خدائے قادرِ مطلق کا کلام ہے جس کی قدرتیں زمین و آسمان کی مصنوعات میں ظاہر ہیں۔ وہی خدا جو اپنی باتوں اور کاموں میں بے مثل و مانند ہے پھر جب ہم ایک طرف ایسے ایسے معجزات قرآن شریف میں پاتے ہیں اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیّت کو دیکھتے ہیں اور اس بات کو اپنے تصور میں لاتے ہیں کہ آپ نے ایک حرف بھی کسی اُستاد سے نہیں پڑھا تھا اور نہ آپ نے طبعی اور فلسفہ سے کچھ حاصل کیا تھا بلکہ آپ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے کہ جو سب کی سب اُمی اور ناخواندہ تھی اور ایک وحشیانہ زندگی رکھتی تھی اور با ایں ہمہ آپ نے والدین کی تربیت کا زمانہ بھی نہیں پایا تھا۔ تو ان سب باتوں کو مجموعی نظر کے ساتھ دیکھنے سے قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے پر ایک ایسی چمکتی ہوئی بصیرت ہمیں ملتی ہے اور اس کا علمی معجزہ ہونا ایسے یقین کے ساتھ ہمارے دل میں بھر جاتا ہے کہ گویا ہم اس کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتے ہیں۔ غرض جب کہ بدیہی طور پر ثابت ہے کہ سورۃ المؤمنون کی یہ تمام آیات جو ابتدائے سورۃ سے لے کر آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[1] تک ہیں علمی معجزہ ہیں۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ علمی معجزہ کی ایک جزو ہے اور بباعث معجزہ کے جزو ہونے کے معجزہ میں داخل ہے اور یہی ثابت کرنا تھا۔

اور یاد رہے کہ یہ علمی معجزہ مذکورہ بالا ایک ایسی صاف اور کھلی کھلی اور روشن اور بدیہی ﴿۷۰﴾

[1] المؤمنون: ۱۵

سچائی ہے کہ اب خدا تعالیٰ کی کلام کی رہبری اور یاددہانی کے بعد عقل بھی اپنے معقولی علوم میں بہت فخر کے ساتھ اس کو داخل کرنے کے لئے طیار ہے۔

کیونکہ عندالعقل یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے پہلے جو ایک سعید الفطرت آدمی کے نفس کو خدا تعالیٰ کی طرف اس کی طلب میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ خشوع اور انکسار ہے اور خشوع سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے فروتنی اور تواضع اور تضرع کی حالت اختیار کی جائے اور جو اس کے مقابل پر اخلاقِ ردّیہ ہیں جیسے تکبر اور عجب اور ریا اور لاپروائی اور بے نیازی ان سب کو خدا تعالیٰ کے خوف سے چھوڑ دیا جائے اور یہ بات بدیہی ہے کہ جب تک انسان اپنے اخلاق ردّیہ کو نہیں چھوڑتا اس وقت تک اُن اخلاق کے مقابل پر جو اخلاق فاضلہ ہیں جو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں اُن کو قبول نہیں کرسکتا کیونکہ دو ضدیں ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ سورۂ بقر کی ابتدا میں اس نے فرمایا ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[1] یعنی قرآن شریف ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو متقی ہیں یعنی وہ لوگ جو تکبر نہیں کرتے اور خشوع اور انکسار سے خدا تعالیٰ کے کلام میں غور کرتے ہیں وہی ہیں جو آخر کو ہدایت پاتے ہیں۔ اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ ان آیات میں چھ جگہ اَفْلَحَ کا لفظ ہے۔ پہلی آیت میں صریح طور پر جیسا کہ فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ[2] اور بعد کی آیتوں میں عطف کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اَفْلَحَ کے لُغت میں یہ معنے ہیں اُصِیْبَ اِلَی الفَلَاحِ یعنی فوز مرام کی طرف پھیرا گیا اور حرکت دیا گیا۔ پس ان معنوں کی رُو سے مومن کا نماز میں خشوع اختیار کرنا فوزِ مرام کے لئے پہلی حرکت ہے جس کے ساتھ تکبر اور عُجب وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور اس میں فوزِ مرام یہ ہے کہ انسان کا نفس خشوع کی سیرت اختیار کر کے خدائے تعالیٰ سے تعلق پکڑنے کے لئے مستعد اور طیار ہو جاتا ہے۔

دوسرا کام مومن کا یعنی وہ کام جس سے دوسرے مرتبہ تک قوّتِ ایمانی پہنچتی ہے اور ﴿۱۷﴾

[1] البقرۃ:۳ [2] المؤمنون:۲،۳

پہلے کی نسبت ایمان کچھ قوی ہو جاتا ہے عقل سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ مومن اپنے دل کو جو خشوع کے مرتبہ تک پہنچ چکا ہے لغو خیالات اور لغو شغلوں سے پاک کرے کیونکہ جب تک مومن یہ ادنیٰ قوت حاصل نہ کر لے کہ خدا کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو ترک کر سکے جو کچھ بھی مشکل نہیں اور صرف گناہ بے لذت ہے اُس وقت تک یہ طمع خام ہے کہ مومن ایسے کاموں سے دست بردار ہو سکے جن سے دست بردار ہونا نفس پر بہت بھاری ہے اور جن کے ارتکاب میں نفس کو کوئی فائدہ یا لذت ہے۔ پس اِس سے ثابت ہے کہ پہلے درجہ کے بعد کہ ترکِ تکبر ہے دوسرا درجہ ترکِ لغویات ہے۔ اور اس درجہ پر وعدہ جو لفظ اَفْلَحَ سے کیا گیا ہے یعنی فوزِ مرام اس طرح پر پورا ہوتا ہے کہ مومن کا تعلق جب لغو کاموں اور لغو شغلوں سے ٹوٹ جاتا ہے تو ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے اس کو ہو جاتا ہے اور قوت ایمانی بھی پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خفیف تعلق اس لئے ہم نے کہا کہ لغویات سے تعلق بھی خفیف ہی ہوتا ہے پس خفیف تعلق چھوڑنے سے خفیف تعلق ہی ملتا ہے۔

پھر تیسرا کام مومن کا جس سے تیسرے درجے تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عقل سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف لغو کاموں اور لغو باتوں کو ہی خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑتا بلکہ اپنا عزیز مال بھی خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لغو کاموں کے چھوڑنے کی نسبت مال کا چھوڑنا نفس پر زیادہ بھاری ہے کیونکہ وہ محنت سے کمایا ہوا اور ایک کارآمد چیز ہوتی ہے۔ جس پر خوش زندگی اور آرام کا مدار ہے اس لئے مال کا خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو کاموں کے چھوڑنے کے قوتِ ایمانی کو زیادہ چاہتا ہے اور لفظ اَفْلَحَ کا جو آیات میں وعدہ ہے اس کے اس جگہ یہ معنی ہوں گے کہ دوسرے درجہ کی نسبت اس مرتبہ میں قوت ایمانی اور تعلق بھی خدا تعالیٰ سے زیادہ ہو جاتی ہے اور نفس کی پاکیزگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اپنے ہاتھ سے اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کے خوف سے نکالنا بجز نفس کی پاکیزگی کے ممکن نہیں۔

پھر چوتھا کام مومن کا جس سے چوتھے درجہ تک قوت ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے ﴿۷۲﴾

نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف مال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں ترک نہیں کرتا بلکہ وہ چیز جس سے وہ مال سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے یعنی شہوات نفسانیہ اُن کا وہ حصہ جو حرام کے طور پر ہے چھوڑ دیتا ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک انسان اپنی شہواتِ نفسانیہ کو طبعًا مال سے عزیز تر سمجھتا ہے اور مال کو ان کی راہ میں فدا کرتا ہے۔ پس بلا شبہ مال کے چھوڑنے سے خدا کے لئے شہوات کو چھوڑنا بہت بھاری ہے اور لفظ اَفْلَحَ جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اُس کے اِس جگہ یہ معنی ہیں کہ جیسے شہواتِ نفسانیہ سے انسان کو طبعًا شدید تعلق ہوتا ہے ایسا ہی ان کے چھوڑنے کے بعد وہی شدید تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو شخص کوئی چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں کھوتا ہے اُس سے بہتر پالیتا ہے۔ ؎

لُطفِ او ترک طالبان نہ کند کس بہ کارِ رہش زیان نہ کند

ہر کہ آن راہ جُست یافتہ است تافت آن رو کہ سر نتافتہ است

پھر پانچواں کام مومن کا جس سے پانچویں درجہ تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عندالعقل یہ ہے کہ صرف ترک شہواتِ نفس ہی نہ کرے بلکہ خدا کی راہ میں خود نفس کو ہی ترک کر دے اور اس کے فدا کرنے پر طیار رہے۔ یعنی نفس جو خدا کی امانت ہے اسی مالک کو واپس دیدے اور نفس سے صرف اس قدر تعلق رکھے جیسا کہ ایک امانت سے تعلق ہوتا ہے اور دقائق تقویٰ ایسے طور پر پوری کرے کہ گویا اپنے نفس☆ اور مال اور تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں وقف کر چکا ہے۔ اِسی طرف یہ آیت اشارہ فرماتی ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[1] پس جبکہ انسان کے جان و مال اور تمام قسم کے آرام خدا کی امانت ہے جس کو واپس دینا امین ہونے کے لئے شرط ہے لہٰذا ترکِ نفس وغیرہ کے یہی معنے ہیں کہ یہ امانت خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے اس طور سے

☆ جیسا کہ نفس خدا تعالیٰ کی امانت ہے ایسا ہی مال بھی خدا تعالیٰ کی امانت ہے۔ پس جو شخص صرف اپنے مال میں سے زکوٰۃ دیتا ہے وہ مال کو اپنا مال سمجھتا ہے مگر جو شخص مال کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھتا ہے وہ اپنے تمام مال کو خدا تعالیٰ کا مال جانتا ہے اور ہر ایک وقت خدا کی راہ میں دیتا ہے گو کوئی زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ منہ

[1] المومنون: ۹

یہ قربانی ادا کردے اور دوسرے یہ کہ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے وقت اس کا عہد تھا اور جو عہد اور امانتیں مخلوق کی اس کی گردن پر ہیں اُن سب کو ایسے طور سے تقویٰ کی رعایت سے بجا لاوے کہ وہ بھی ایک سچی قربانی ہو جاوے کیونکہ دقائقِ تقویٰ کو انتہا تک پہنچانا یہ بھی ایک قسم کی موت ہے۔ اور لفظ اَفْلَحَ کا جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اِس کے اس جگہ یہ معنے ہیں ﴿۷۳﴾
کہ جب اس درجہ کا مومن خدا تعالیٰ کی راہ میں بذلِ نفس کرتا ہے اور تمام دقائقِ تقویٰ بجالاتا ہے۔ تب حضرتِ احدیت سے انوارِ الٰہیہ اُس کے وجود پر محیط ہو کر روحانی خوبصورتی اُس کو بخشتے ہیں جیسے کہ گوشت ہڈیوں پر چڑھ کر ان کو خوبصورت بنا دیتا ہے اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اِن دونوں حالتوں کا نام خدا تعالیٰ نے لباس ہی رکھا ہے۔ تقویٰ کا نام بھی لباس ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لِبَاسُ التَّقْوٰى [1] اور جو گوشت ہڈیوں پر چڑھتا ہے وہ بھی لباس ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا [2] کیونکہ کَسَوت جس سے کَسَونَا کا لفظ نکلا ہے لباس کو ہی کہتے ہیں۔

اب یاد رہے کہ منتہا سلوک کا پنجم درجہ ہے۔ اور جب پنجم درجہ کی حالت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد چھٹا درجہ ہے جو محض ایک موہبت کے طور پر ہے اور جو بغیر کسب اور کوشش کے مومن کو عطا ہوتا ہے اور کسب کا اس میں ذرّہ دخل نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جیسے مومن خدا کی راہ میں اپنی روح کھوتا ہے ایک روح اس کو عطا کی جاتی ہے کیونکہ ابتدا سے یہ وعدہ ہے کہ جو کوئی خدا تعالیٰ کی راہ میں کچھ کھوئے گا وہ اُسے پائے گا۔ اس لئے روح کو کھونے والے روح کو پاتے ہیں۔ پس چونکہ مومن اپنی محبت ذاتیہ سے خدا کی راہ میں اپنی جان وقف کرتا ہے اس لئے خدا کی محبت ذاتیہ کی روح کو پاتا ہے جس کے ساتھ روح القدس شامل ہوتا ہے۔ خدا کی محبت ذاتیہ ایک روح ہے اور روح کا کام مومن کے اندر کرتی ہے اس لئے وہ خود رُوح ہے اور رُوح القدس اس سے جدا نہیں کیونکہ اس محبت اور رُوح القدس میں کبھی انفکاک ہو ہی نہیں سکتا۔ اِسی وجہ سے ہم نے اکثر جگہ صرف محبت ذاتیہ الٰہیہ کا ذکر کیا ہے اور رُوح القدس کا نام نہیں لیا کیونکہ ان کا باہم تلازم ہے اور جب رُوح

[1] الاعراف: ۲۷ [2] المؤمنون: ۱۵

﴿۷۴﴾ کسی مومن پر نازل ہوتی ہے تو تمام بوجھ عبادات کا اس کے سر پر سے ساقط ہو جاتا ہے اور اُس میں ایک ایسی قوت اور لذت آ جاتی ہے جو وہ قوت تکلّف سے نہیں بلکہ طبعی جوش سے یادِ الٰہی اُس سے کراتی ہے اور عاشقانہ جوش اُس کو بخشتی ہے۔ پس ایسا مومن جبرائیل علیہ السلام کی طرح ہر وقت آستانہ الٰہی کے آگے حاضر رہتا ہے اور حضرت عزت کی دائمی ہمسائیگی اس کے نصیب ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اِس درجہ کے بارے میں فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[1] یعنی مومن کامل وہ لوگ ہیں کہ ایسا دائمی حضور اُن کو میسر آتا ہے کہ ہمیشہ وہ اپنی نماز کے آپ نگہبان رہتے ہیں۔ یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہے کہ اس درجہ کا مومن اپنی رُوحانی بقا کے لئے نماز کو ایک ضروری چیز سمجھتا ہے اور اس کو اپنی غذا قرار دیتا ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتا۔ یہ درجہ بغیر اس رُوح کے حاصل نہیں ہو سکتا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مومن پر نازل ہوتی ہے کیونکہ جب کہ مومن خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جان کو ترک کر دیتا ہے تو ایک دوسری جان پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اِس تمام تقریر سے ثابت ہے کہ یہ مراتب ستہ عقل سلیم کے نزدیک اُس مومن کی راہ میں پڑے ہیں جو اپنے وجود روحانی کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے اور ہر ایک انسان تھوڑے سے غور کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ ضرور مومن پر اس کے سلوک کے وقت چھ حالتیں آتی ہیں۔ وجہ یہ کہ جب تک انسان خدا تعالیٰ سے کامل تعلق نہیں پکڑتا تب تک اُس کا نفس ناقص پانچ خراب حالتوں سے پیار کرتا ہے اور ہر ایک حالت کا پیار دُور کرنے کے لئے ایک ایسے سبب کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس پیار پر غالب آ جائے۔ اور نیا پیار پہلے پیار کا علاقہ توڑ دے۔

چنانچہ پہلی حالت جس سے وہ پیار کرتا ہے یہ ہے کہ وہ ایک غفلت میں پڑا ہوتا ہے اور اس کو بالکل خدا تعالیٰ سے بُعد اور دُوری ہوتی ہے اور نفس ایک کفر کے رنگ میں ہوتا ہے اور غفلت کے پردے تکبّر اور لاپروائی اور سنگدلی کی طرف اس کو کھینچتے ہیں اور خشوع اور خضوع اور تواضع اور فروتنی اور انکسار کا نام ونشان اس میں نہیں ہوتا اور اسی اپنی حالت سے وہ محبت کرتا ہے اور

[1] المؤمنون:۱۰

اس کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے اور پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس کی اصلاح کی طرف توجہ کرتی ہے تو کسی واقعہ کے پیدا ہونے سے یا کسی آفت کے نازل ہونے سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا اس کے دل پر اثر پڑتا ہے اور اس اثر سے اُس پر ایک حالت خشوع پیدا ہو جاتی ہے جو اُس کے تکبر اور گردن کشی اور غفلت کی عادت کو کالعدم کر دیتی ہے اور اس سے علاقہ محبت توڑ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر وقت دنیا میں مشاہدہ میں آتی رہتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ جب ہیبتِ الٰہی کا تازیانہ کسی خوفناک لباس میں نازل ہوتا ہے تو بڑے بڑے شریروں کی گردن جھکا دیتا ہے اور خوابِ غفلت سے جگا کر خشوع اور خضوع کی حالت بنا دیتا ہے یہ وہ پہلا مرتبہ رجوع الی اللہ کا ہے جو عظمت اور ہیبت الٰہی کے مشاہدہ کے بعد یا کسی اور طور سے ایک سعید الفطرت کو حاصل ہو جاتا ہے اور گو وہ پہلے اپنی غافلانہ اور بے قید زندگی سے محبت ہی رکھتا تھا مگر جب مخالف اثر اُس پہلے اثر سے قوی تر پیدا ہوتا ہے تو اس حالت کو بہر حال چھوڑنا پڑتا ہے۔ ﴿۷۵﴾

پھر اس کے بعد دوسری حالت یہ ہے کہ ایسے مومن کو خدا تعالیٰ کی طرف کچھ رجوع تو ہو جاتا ہے مگر اس رجوع کے ساتھ لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو شغلوں کی پلیدی لگی رہتی ہے جس سے وہ اُنس اور محبت رکھتا ہے۔ ہاں کبھی نماز میں خشوع کے حالات بھی اس سے ظہور میں آتے ہیں لیکن دوسری طرف لغو حرکات بھی اس کے لازمِ حال رہتی ہیں اور لغو تعلقات اور لغو مجلسیں اور لغو ہنسی ٹھٹھا اس کے گلے کا ہار رہتا ہے۔ گویا وہ دو رنگ رکھتا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر مے کنند چوں بخلوت مے روند آن کارِ دیگر مے کنند

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تو پھر ایک اَور جلوہ عظمت اور ہیبت اور جبروتِ الٰہی کا اُس کے دل پر نازل ہوتا ہے جو پہلے جلوہ سے زیادہ تیز ہوتا ہے اور قوتِ ایمانی اُس سے تیز ہو جاتی ہے اور ایک آگ کی طرح مومن کے دل پر پڑ کر تمام خیالات لغو اس کے ایک دم میں بھسم کر دیتی ہے۔ اور یہ جلوہ عظمت اور جبروتِ الٰہی کا اس قدر حضرتِ عزت کی محبت

اُس کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ لغو کاموں اور لغو شغلوں کی محبت پر غالب آ جاتا ہے اور ان کو دفع اور دُور کر کے اُن کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور تمام بیہودہ شغلوں سے دل کو سرد کر دیتا ہے تب لغو کاموں سے دل کو ایک کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔

﴿۷۶﴾ پھر لغو شغلوں اور لغو کاموں کے دُور ہونے کے بعد ایک تیسری خراب حالت مومن میں باقی رہ جاتی ہے جس سے وہ دوسری حالت کی نسبت بہت محبت رکھتا ہے یعنی طبعاً مال کی محبت اس کے دل میں ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی اور آرام کا مدار مال کو ہی سمجھتا ہے اور نیز اس کے حاصل ہونے کا ذریعہ صرف اپنی محنت اور مشقت خیال کرتا ہے۔ پس اس وجہ سے اس پر خدا تعالیٰ کی راہ میں مال کا چھوڑنا بہت بھاری اور تلخ ہوتا ہے۔

پھر جب عنایت الٰہیہ اس ورطۂ عظیمہ سے اُس کو نکالنا چاہتی ہے تو رازقیتِ الٰہیہ کا علم اُس کو عطا کیا جاتا ہے اور توکل کا بیج اُس میں بویا جاتا ہے اور ساتھ اس کے ہیبتِ الٰہیہ بھی کام کرتی ہے اور دونوں تجلّیات جمالی اور جلالی اُس کے دل کو اپنے قابو میں لے آتی ہیں۔ تب مال کی محبت بھی دل میں سے بھاگ جاتی ہے اور مال دینے والے کی محبت کا تخم دل میں بویا جاتا ہے اور ایمان قوی کیا جاتا ہے۔ اور یہ قوتِ ایمانی درجہ سوم کی قوت سے بڑھ کر ہوتی ہے کیونکہ اس جگہ مومن صرف لغو باتوں کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ اُس مال کو ترک کرتا ہے جس پر اپنی خوش زندگی کا سارا مدار سمجھتا ہے۔ اور اگر اس کے ایمان کو قوتِ توکل عطا نہ کی جاتی اور رازقِ حقیقی کی طرف آنکھ کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ بخل کی بیماری دُور ہو سکتی۔ پس یہ قوتِ ایمانی نہ صرف لغو کاموں سے چھڑاتی ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے رازق ہونے پر ایک قوی ایمان پیدا کر دیتی ہے۔ اور نورِ توکل دل میں ڈال دیتی ہے۔ تب مال جو ایک پارۂ جگر سمجھا جاتا ہے بہت آسانی اور شرح صدر سے مومن اس کو خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے اور وہ ضعف جو بخل کی حالت میں نومیدی سے پیدا ہوتا ہے۔ اب خدا تعالیٰ پر بہت سی امیدیں ہو کر وہ تمام ضعف جاتا رہتا ہے۔ اور مال دینے والے کی محبت مال کی محبت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

پھر بعد اس کے چوتھی حالت ہے جس سے نفسِ امّارہ بہت ہی پیار کرتا ہے اور جو تیسری حالت سے بدتر ہے کیونکہ تیسری حالت میں تو صرف مال کا اپنے ہاتھ سے چھوڑنا ہے مگر چوتھی حالت میں نفس امارہ کی شہواتِ محرمہ کو چھوڑنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مال کا چھوڑنا بہ نسبت شہوات کے چھوڑنے کے انسان پر طبعًا سہل ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حالت بہ نسبت حالات ﴿۷۷﴾
گذشتہ کے بہت شدید اور خطرناک ہے اور فطرتًا انسان کو شہوات نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق کے بہت پیارا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اُس کے نزدیک مدارِ آسائش ہے بڑی خوشی سے شہوات نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے۔ اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے۔ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ [1] یعنی یہ ایسا مُنہ زور جوش ہے جو اِس کافر و ہونا کسی برہانِ قوی کا محتاج ہے۔ پس ظاہر ہے کہ درجہ چہارم پر قوتِ ایمانی بہ نسبت درجہ سوم کے بہت قوی اور زبردست ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا مشاہدہ بھی پہلے کی نسبت اُس میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی اس میں نہایت ضروری ہے کہ جس لذت ممنوعہ کو دُور کیا گیا ہے اس کے عوض میں روحانی طور پر کوئی لذت بھی حاصل ہو۔ اور جیسا کہ بخل کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی رازقیت پر قوی ایمان درکار ہے۔ اور خالی جیب ہونے کی حالت میں ایک قوی توکل کی ضرورت ہے تا بخل بھی دُور ہو اور غیبی فتوح پر اُمید بھی پیدا ہو جائے۔ ایسا ہی شہوات ناپاک نفسانیہ کے دُور کرنے کے لئے اور آتشِ شہوت سے مخلصی پانے کے لئے اس آگ کے وجود پر قوی ایمان ضروری ہے جو جسم اور رُوح دونوں کو عذاب شدید میں ڈالتی ہے اور نیز ساتھ اس کے اُس رُوحانی لذت کی ضرورت ہے جو ان کثیف لذتوں سے بے نیاز اور مستغنی کر دیتی ہے۔ جو شخص شہوات نفسانیہ محرمہ کے پنجہ میں اسیر ہے وہ ایک اژدہا کے مُنہ میں ہے جو نہایت خطرناک زہر رکھتا ہے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ جیسا کہ لغو حرکات کی بیماری سے بخل کی بیماری بڑھ کر ہے اِسی طرح بخل کی بیماری کے مقابل پر شہوات نفسانیہ محرمہ کے پنجہ میں اسیر ہونا سب بلاؤں سے زیادہ

[1] یوسف: ۲۵

بلا ہے جو خدائے تعالیٰ کے ایک خاص رحم کی محتاج ہے اور جب خدا تعالیٰ کسی کو اس بلا سے نجات دینا چاہتا ہے تو اپنی عظمت اور ہیبت اور جبروت کی ایسی تجلّی اس پر کرتا ہے جس سے شہواتِ نفسانیہ محرمہ پارہ پارہ ہو جاتی ہیں اور پھر جمالی رنگ میں اپنی لطیف محبت کا ذوق اس کے دل میں ڈالتا ہے اور جس طرح شیر خوار بچہ دودھ چھوڑنے کے بعد صرف ایک رات تلخی میں گذارتا ہے بعد اس کے اس دودھ کو ایسا فراموش کر دیتا ہے کہ چھاتیوں کے سامنے بھی اگر اس کے مُنہ کو رکھا جائے تب بھی دودھ پینے سے نفرت کرتا ہے۔ یہی نفرت شہواتِ محرمہ نفسانیہ سے اُس راستباز کو ہو جاتی ہے جس کو نفسانی دودھ چھڑا کر ایک روحانی غذا اس کے عوض میں دی جاتی ہے۔ ﴿۷۸﴾

پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبت نفس امارہ کو ہے کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ حضرت عزت جلّ شانہٗ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کر لیں اور اُس پر اپنا پورا تصرف اور دخل کر لیں اور تمام نفسانی سِلسلہ کو درہم برہم کر دیں۔ اور نفسانی قویٰ کے قریہ کو ویران کر دیں اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلا دیں اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ[1] اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اُس کے تمام مراتب سلوک ختم ہو جاتے ہیں اور اس کا سلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور انسانی کوششیں اپنے اَخیر نقطہ تک منزل طے کر لیتی ہیں۔ پھر بعد اس کے صرف موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلق آخر کے متعلق ہے۔ اور یہ پانچویں[5] حالت چوتھی[4] حالت سے مشکل تر ہے کیونکہ چوتھی حالت میں تو صرف مومن کا کام یہ ہے کہ شہوات محرمہ نفسانیہ کو ترک کرے مگر پانچویں حالت میں مومن کا کام یہ ہے کہ نفس کو بھی ترک کر دے اور اس کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر خدا تعالیٰ کی طرف واپس کرے اور خدا کے کاموں میں اپنے نفس کو وقف کر کے

[1] النّمل: ۳۵

اس سے خدمت لے اور خدا کی راہ میں بذل نفس کرنے کا ارادہ رکھے اور اپنے نفس کی نفی وجود کے لئے کوشش کرے۔ کیونکہ جب تک نفس کا وجود باقی ہے گناہ کرنے کے لئے جذبات بھی باقی ہیں جو تقویٰ کے برخلاف ہیں۔ اور نیز جب تک وجود نفس باقی ہے ممکن نہیں کہ انسان تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مار سکے یا پورے طور پر خدا کی امانتوں اور عہدوں یا مخلوق کی امانتوں اور عہدوں کو ادا کر سکے لیکن جیسا کہ بخل بغیر توکل اور خدا کی رازقیت پر ایمان لانے کے ترک نہیں ہوسکتا اور شہوات نفسانیہ محرمہ بغیر استیلاء ہیبت اور عظمت الٰہی اور لذات روحانیہ کے چھوٹ نہیں سکتیں ایسا ہی یہ مرتبہ عظمیٰ کہ ترک نفس کر کے تمام امانتیں خدا تعالیٰ کی اس کو واپس دی جائیں کبھی حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک تیز آندھی عشقِ الٰہی کی چل کر کسی کو اس کی راہ میں دیوانہ نہ بنا دے۔ یہ تو درحقیقت عشقِ الٰہی کے مستوں اور دیوانوں کے کام ہیں دنیا کے عقلمندوں کے کام نہیں ؎

﴿۷۹﴾

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اسی کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا[1] ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیے تمام زمین و آسمان کی مخلوق پر پیش کیا۔ پس سب نے اُس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اٹھا لیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محل مدح میں ہیں نہ محل مذمت میں اور ان کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر ظلم اور سختی کر سکتا تھا۔ اور ایسا خدا تعالیٰ کی طرف جھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے اس لئے اُس نے منظور کیا کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے لئے یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[2] یعنی مومن وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی رعایت رکھتے ہیں یعنی ادائے امانت

[1] الاحزاب:۷۳ [2] المؤمنون:۹

اور ایفائے عہد کے بارے میں کوئی دقیقہ تقویٰ اور احتیاط کا باقی نہیں چھوڑتے۔ یہ اس امانت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا نفس اور اس کے تمام قویٰ اور آنکھ کی بینائی اور کانوں کی شنوائی اور زبان کی گویائی اور ہاتھوں پیروں کی قوت یہ سب خدا تعالیٰ کی امانتیں ہیں جو اُس نے دی ہیں اور جس وقت وہ چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے سکتا ہے۔ پس ان تمام امانتوں کا رعایت رکھنا یہ ہے کہ باریک در باریک تقویٰ کی پابندی سے خدا تعالیٰ کی خدمت میں نفس اور اُس کے تمام قویٰ ﴿۸۰﴾ اور جسم اور اس کے تمام قویٰ اور جوارح کو لگایا جائے اِس طرح پر کہ گویا یہ تمام چیزیں اُس کی نہیں بلکہ خدا کی ہو جائیں اور اُس کی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی کے موافق ان تمام قویٰ اور اعضاء کا حرکت اور سکون ہو اور اس کا ارادہ کچھ بھی نہ رہے بلکہ خدا کا ارادہ اُن میں کام کرے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں اس کا نفس ایسا ہو جیسا کہ مُردہ زندہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور یہ خودرائی سے بے دخل ہو اور خدا تعالیٰ کا پورا تصرف اس کے وجود پر ہو جائے یہاں تک کہ اُسی سے دیکھے اور اُسی سے سنے اور اُسی سے بولے اور اُسی سے حرکت یا سکون کرے اور نفس کی دقیق در دقیق آلائشیں جو کسی خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتیں دُور ہو کر فقط رُوح رہ جائے۔ غرض مہیمنت خدا کی اس پر احاطہ کر لے اور اپنے وجود سے اس کو کھو دے اور اُس کی حکومت اپنے وجود پر کچھ نہ رہے اور سب حکومت خدا کی ہو جائے اور نفسانی جوش سب مفقود ہو جائیں اور الوہیت کے ارادے اُس کے وجود میں جوش زن ہو جائیں۔ پہلی حکومت بالکل اُٹھ جائے اور دوسری حکومت دل میں قائم ہو اور نفسانیت کا گھر ویران ہو اور اُس جگہ پر حضرت عزت کے خیمے لگائے جائیں اور ہیبت اور جبروت الٰہی تمام اُن پودوں کو جن کی آب پاشی گندے چشمۂ نفس سے ہوتی تھی اس پلید جگہ سے اکھیڑ کر رضا جوئی حضرت عزت کی پاک زمین میں لگا دئے جائیں اور تمام آرزوئیں اور تمام ارادے اور تمام خواہشیں خدا میں ہو جائیں اور نفس امارہ کی تمام عمارتیں منہدم کر کے خاک میں ملا دی جائیں اور ایک ایسا پاک محل تقدس اور تطہّر کا دل میں طیار کیا جاوے جس میں حضرت عزت نازل ہو سکے اور اس کی روح اس میں آباد ہو سکے

اس قدر تکمیل کے بعد کہا جائے گا کہ وہ امانتیں جو منعم حقیقی نے انسان کو دی تھیں وہ واپس کی گئیں۔ تب ایسے شخص پر یہ آیت صادق آئے گی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ[1] اس درجہ پر صرف ایک قالب تیار ہوتا ہے اور تجلی الٰہی کی رُوح جس سے مراد محبت ذاتیہ حضرت عزت ہے بعد اس کے مع رُوح القدس ایسے مومن کے اندر داخل ہوتی اور نئی حیات اُس کو بخشتی ہے اور ایک نئی قوت اس کو عطا کی جاتی ہے اور اگرچہ یہ سب کچھ رُوح کے اثر سے ہی ہوتا ہے لیکن ہنوز روح مومن سے صرف ایک تعلق رکھتی ہے اور ابھی مومن کے دل کے اندر آباد نہیں ہوتی۔ ﴿۸۱﴾

پھر بعد اس کے وجود رُوحانی کا مرتبہ ششم ہے یہ وہی مرتبہ ہے جس میں مومن کی محبت ذاتیہ اپنے کمال کو پہنچ کر اللہ جلّ شانہٗ کی محبت ذاتیہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب خدا تعالیٰ کی وہ محبت ذاتی مومن کے اندر داخل ہوتی اور اس پر احاطہ کرتی ہے جس سے ایک نئی اور فوق العادت طاقت مومن کو ملتی ہے اور وہ ایمانی طاقت ایمان میں ایک ایسی زندگی پیدا کرتی ہے جیسے ایک قالبِ بے جان میں روح داخل ہو جاتی ہے بلکہ وہ مومن میں داخل ہو کر درحقیقت ایک رُوح کا کام کرتی ہے۔ تمام قویٰ میں اس سے ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ اور رُوح القدس کی تائید ایسے مومن کے شامل حال ہوتی ہے کہ وہ باتیں اور وہ علوم جو انسانی طاقت سے برتر ہیں وہ اس درجہ کے مومن پر کھولے جاتے ہیں اور اس درجہ کا مومن ایمانی ترقیات کے تمام مراتب طے کر کے ان ظلی کمالات کی وجہ سے جو حضرت عزت کے کمالات سے اُس کو ملتے ہیں آسمان پر خلیفۃ اللہ کا لقب پاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ایک شخص جب آئینہ کے مقابل پر کھڑا ہوتا ہے تو تمام نقوش اس کے منہ کے نہایت صفائی سے آئینہ میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی اس درجہ کا مومن جو نہ صرف ترک نفس کرتا ہے بلکہ نفیٔ وجود اور ترکِ نفس کے کام کو اس درجہ کے کمال تک پہنچاتا ہے کہ اس کے وجود میں سے کچھ بھی نہیں رہتا اور صرف آئینہ کے رنگ میں ہو جاتا ہے۔ تب ذاتِ الٰہی کے تمام نقوش اور تمام

[1] المؤمنون:۹

اخلاق اس میں مندرج ہو جاتے ہیں اور جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آئینہ جو ایک سامنے کھڑے ہونے والے مُنہ کے تمام نقوش اپنے اندر لے کر اس مُنہ کا خلیفہ ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مومن بھی ظلّی طور پر اخلاق اور صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر لے کر خلافت کا درجہ اپنے اندر حاصل کرتا ہے اور ظلّی طور پر الٰہی صورت کا مظہر ہو جاتا ہے اور جیسا کہ خدا غیب الغیب ہے اور اپنی ذات میں وراء الوراء ہے ایسا ہی یہ مومن کامل اپنی ذات میں غیب الغیب اور وراء الوراء ہوتا ہے۔ دنیا اس کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کے دائرہ سے بہت ہی دُور چلا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خدا جو غیر متبدل اور حیّ و قیّوم ہے وہ مومن کامل کی اُس پاک تبدیلی کے بعد جب کہ مومن خدا کے لئے اپنا وجود بالکل کھو دیتا ہے اور ایک نیا چولا پاک تبدیلی کا پہن کر اُس میں سے اپنا سر نکالتا ہے۔ تب خدا بھی اس کے لئے اپنی ذات میں ایک تبدیلی کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ خدا کی ازلی ابدی صفات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ وہ قدیم سے اور ازل سے غیر متبدل ہے۔ لیکن یہ صرف مومن کامل کے لئے جلوۂ قدرت ہوتا ہے اور ایک تبدیلی جس کی ہم کُنہ نہیں سمجھ سکتے مومن کی تبدیلی کے ساتھ خدا میں بھی ظہور میں آجاتی ہے مگر اس طرح پر کہ اُس کی غیر متبدل ذات پر کوئی گرد و غبار حدوث کا نہیں بیٹھتا۔ وہ اسی طرح غیر متبدل ہوتا ہے جس طرح وہ قدیم سے ہے لیکن یہ تبدیلی جو مومن کی تبدیلی کے وقت ہوتی ہے یہ اس قسم کی ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ جب مومن خدائے تعالیٰ کی طرف حرکت کرتا ہے تو خدا اس کی نسبت تیز حرکت کے ساتھ اُس کی طرف آتا ہے اور ظاہر ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ تبدیلیوں سے پاک ہے ایسا ہی وہ حرکتوں سے بھی پاک ہے۔ لیکن یہ تمام الفاظ استعارہ کے رنگ میں بولے جاتے ہیں اور بولنے کی اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ تجربہ شہادت دیتا ہے کہ جیسے ایک مومن خدائے تعالیٰ کی راہ میں نیستی اور فنا اور اِستھلاک کر کے اپنے تئیں ایک نیا وجود بناتا ہے اس کی ان تبدیلیوں کے مقابل پر خدا بھی اس کے لئے ایک نیا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ معاملات کرتا ہے جو دوسرے کے ساتھ کبھی نہیں کرتا۔ اور اس کو اپنے ملکوت اور اسرار کا وہ سَیر ﴿۸۲﴾

کراتا ہے جو دوسرے کو ہرگز نہیں دکھلاتا۔ اور اس کے لئے وہ کام اپنے ظاہر کرتا ہے جو دوسروں کے لئے ایسے کام کبھی ظاہر نہیں کرتا۔ اور اس قدر اس کی نصرت اور مدد کرتا ہے کہ لوگوں کو تعجب میں ڈالتا ہے۔ اس کے لئے خوارق دکھلاتا ہے اور معجزات ظاہر کرتا اور ہر ایک پہلو سے اس کو غالب کر دیتا ہے اور اس کی ذات میں ایک قوتِ کشش رکھ دیتا ہے جس سے ایک جہان اُس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور وہی باقی رہ جاتے ہیں جن پر شقاوتِ ازلی غالب ہے۔

﴿۸۳﴾ پس اِن تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ مومن کامل کی پاک تبدیلی کے ساتھ خدا تعالیٰ بھی ایک نئی صورت کی تجلّی سے اُس پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس نے انسان کو اپنے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا شروع کرے تو اُسی دن سے بلکہ اُسی گھڑی سے بلکہ اُسی دم سے خدا تعالیٰ کا رجوع اُس کی طرف شروع ہو جاتا ہے اور وہ اُس کا متولّی اور متکفّل اور حامی اور ناصر بن جاتا ہے اور اگر ایک طرف تمام دنیا ہو اور ایک طرف مومن کامل تو آخر غلبہ اُسی کو ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنی محبت میں صادق ہے اور اپنے وعدوں میں پورا۔ وہ اس کو جو درحقیقت اُس کا ہو جاتا ہے ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ ایسا مومن آگ میں ڈالا جاتا ہے اور گلزار میں سے نکلتا ہے۔ وہ ایک گرداب میں دھکیل دیا جاتا اور ایک خوشنما باغ میں سے نمودار ہو جاتا ہے۔ دشمن اس کے لئے بہت منصوبے کرتے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں لیکن خدا ان کے تمام مکروں اور منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے آخر اُس کے ذلت چاہنے والے ذلت کی مار سے مرتے ہیں اور نامرادی اُن کا انجام ہوتا ہے لیکن وہ جو اپنے تمام دل اور تمام جان اور تمام ہمت کے ساتھ خدا کا ہو گیا ہے وہ نامراد ہرگز نہیں مرتا اور اُس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے اور ضرور ہے کہ وہ جیتا رہے جب تک اپنے کاموں کو پورا کر لے۔ تمام برکتیں اخلاص میں ہیں اور تمام اخلاص خدا کی رضا جوئی میں اور تمام خدا کی رضا جوئی اپنی رضا کے چھوڑنے میں۔ یہی موت ہے جس کے بعد زندگی ہے مبارک وہ جو اس زندگی میں سے حصہ لے۔

اب واضح ہو کہ جہاں تک ہم نے سورۃ المؤمنون کی آیات ممدوحہ بالا کے معجزہ ہونے کی نسبت لکھنا تھا وہ سب ہم لکھ چکے اور بخوبی ثابت کر چکے کہ سورۃ موصوفہ کی ابتدا میں مومن کے وجودِ روحانی کے چھ مراتب قرار دیئے ہیں اور مرتبہ ششم خلق آخر کا رکھا ہے۔ یہی مراتبِ ستّہ سورۃ موصوفہ بالا میں جسمانی پیدائش کے بارہ میں بعد ذکر پیدائش روحانی بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور یہ ایک علمی اعجاز ہے۔ اور یہ علمی نکتہ قرآن شریف سے پہلے کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ پس ان آیات کا آخری حصہ یعنی فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ[1] بلاشبہ ایک علمی معجزہ کی جڑ ہے کیونکہ وہ ایک اعجازی موقعہ پر چسپاں کیا گیا ہے۔ اور انسان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ اپنے بیان میں ایسی اعجازی صورت پیدا کرے اور پھر اس پر آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ چسپاں کرے۔ اور اگر کوئی کہے کہ اِس پر کیا دلیل ہے کہ آیات مذکورہ بالا میں جو مقابلہ انسان کے مراتب پیدائش روحانی اور پیدائش جسمانی میں دکھلایا گیا ہے وہ علمی معجزہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی انسان اس کے مثل بنانے پر قادر نہ ہو سکے یا گذشتہ زمانہ میں قادر نہ ہو سکا ہو اور نہ بعد میں قادر ہونے کا ثبوت ہو۔ پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ یہ بیان انسانی پیدائش کی دقیق فلاسفی کا جو قرآن شریف میں مندرج ہے یہ ایک ایسا بے مثل و مانند بیان ہے کہ اس کی نظیر پہلے اس سے کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ نہ اس زمانہ میں ہم نے سُنا کہ کسی ایسے شخص کو جو قرآن شریف کا علم نہیں رکھتا اس فلاسفی کے بیان کرنے میں قرآن شریف سے توارد ہوا ہو۔ اور جب کہ قرآن شریف اپنے جمیع معارف اور نشانوں اور فصاحت بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ آیات قرآن شریف کا ایک حصہ ہے جو دعویٰ اعجاز میں داخل ہے پس اس کا بے مثل و مانند ثابت ہونا باوجود دعویٰ اعجاز اور طلب مقابلہ کے بلاشبہ معجزہ ہے۔ اور معترض کے بقیہ اعتراضات کا جواب ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

﴿۸۴﴾

قولہ۔ عفت الدیار محلها و مقامها ایک پُرانے شاعر کا مصرع ہے۔ کیا کسی

[1] المؤمنون: ۱۵

نبی کو کبھی ایسی وحی ہوئی جس کے الفاظ حرفاً حرفاً وہی ہوں جو اس نبی سے پہلے کسی آدمی کی زبان سے نکل چکے ہوں۔

اقول ۔جیسا کہ مَیں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں ایسی وحی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تھی۔یعنی **فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین** ۔یہ وہ فقرہ ہے جو عبداللہ ابن ابی سرح کے مُنہ سے نکلا تھا اور بعینہٖ یہی وحی الٰہی ہوئی تھی۔اور اسی ابتلا سے عبداللہ بدقسمت مرتد ہو گیا تھا۔ پس ایسا اعتراض عبداللہ مرتد کے خیالات کی پیروی ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیے تھا۔اور یہ فقرہ یعنی **عفت الدیار محلّھا و مقامھا** یہ لبید رضی اللہ عنہ جو صحابی تھے اُن کے شعر کا پہلا مصرع ہے۔پورا شعر یہ ہے ؎ ﴿۸۵﴾

عفت الدیار محلّھا و مقامھا بِمنًی تأبّد غولھا فرجامھا

اِس کے یہ معنے ہیں کہ میرے پیاروں کے گھر منہدم ہو گئے۔اُن عمارتوں کا نام ونشان نہ رہا جو عارضی سکونت کی عمارتیں تھیں اور نہ وہ عمارتیں رہیں جو مستقل سکونت کی عمارتیں تھیں۔ دونوں قسم کی عمارتیں نابود ہو گئیں اور وہ عمارتیں منٰی میں واقع تھیں جو نجد کی زمین میں ہے۔منٰی دو ہیں۔ایک منٰی مکہ اور ایک منٰی نجد۔اس جگہ منٰی نجد مراد ہے۔اور پھر شاعر کہتا ہے کہ اُس سرزمین کے دو شہر جن میں سے ایک کا نام **غَول** تھا اور دوسرے کا نام **رَجَام** تھا یہ ایسے منہدم ہو کر نابود ہو گئے اور زمین سے ہموار ہو گئے کہ اب اِن شہروں کی جگہ ایک جنگل پڑا ہے جہاں وحشی جانور ہرن وغیرہ رہتے ہیں۔یہ معنی اس عربی لفظ کے ہیں یعنی **تَأَبَّدَ** کے جو شعر میں موجود ہے **تَأَبَّدَ** کا لفظ **اَوَابِد** سے لیا گیا ہے اور **اَوَابِد** جنگلی جانوروں ہرن وغیرہ کو کہتے ہیں۔اور **اَوَابِد** کا لفظ **اَبَد** سے لیا گیا ہے۔اس کے معنے ہیں ہمیشہ جینے والے۔چونکہ ہرن وغیرہ اکثر اپنی موت سے نہیں مرتے بلکہ شکار کئے جاتے ہیں اور دوسرے کے ذریعہ سے ان کی موت آتی ہے اس لئے ان کا نام اوابد رکھا گیا۔

قولہ ۔ اگر انسان کے قول سے خدا کا بھی تو ارد ہو سکتا ہے تو خدا کے قول اور

بندے کے قول میں فرق کیا ہوا؟

اقول۔ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن شریف ان معنوں سے معجزہ ہے کہ کسی انسان کی عبارت کو قرآن شریف کی ایک لمبی عبارت کے ساتھ جو دس آیت سے کم نہ ہو تو اردنہیں ہوسکتا اور اس قدر عبارت قرآن شریف کی اس درجہ کی فصاحت بلاغت اور دیگر معارف اور حقائق اپنے اندر رکھتی ہے جو انسانی طاقتیں اس کی مثل پیش نہیں کرسکتیں اس لئے عبارتِ قرآنی اِس شرط کے ساتھ کہ دس آیت کی مقدار سے کم نہ ہو معجزہ ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے مگر ایک فقرہ جو زیادہ سے زیادہ ایک آیت یا دو آیت کے برابر ہو اس قدر فقرہ میں انسان کے کلام کا خدا کے کلام سے بظاہر تو اردہوسکتا ہے مگر پھر بھی اندرونی طور پر خدا کی کلام میں بعض پوشیدہ معارف اور ایک قسم کا نور ہوتا ہے اور نیز معجزہ میں سے ایک حصہ اس میں مخفی ہوتا ہے۔جیسا کہ انسان اور ہرن میں مابہ الامتیاز مجموعی حالت پر نظر ڈال کر ظاہر ہے لیکن تاہم ہرن کی آنکھ انسان کی آنکھ سے مشابہ ہے مگر پھر بھی انسان کی آنکھ میں بعض وہ قوتیں ہیں جو ہرن کی آنکھ میں ہرگز نہیں۔ ﴿۸۶﴾

قولہ۔جب **عفت الدیار محلّھا و مقامھا** کا الہام شائع ہوا تب اُس کے ذیل میں لکھا گیا تھا کہ متعلق طاعون۔لیکن اب بتایا جاتا ہے کہ زلزلہ کے متعلق ہے۔

اقول۔**عفت الدیار** کے عذاب کا طاعون سے تعلق رکھنا اس کو عین طاعون نہیں بنا سکتا ماسوا اس کے یہ قول کہ **عفت الدیار** کے فقرہ کو طاعون سے تعلق ہے یہ تو انسان کی عبارت ہے۔اعتراض تب ہوسکتا کہ خدا تعالیٰ کی وحی میں یہ لفظ ہوتا۔خدا تعالیٰ کی وحی تو صاف کہتی ہے کہ یہ زلزلہ کے متعلق ہے۔دیکھو وہ الہام جو اُسی اخبار الحکم میں دسمبر ۱۹۰۳ء کے اخیر میں شائع ہوا جس کی یہ عبارت ہے کہ ''**زلزلہ کا دھکا**''۔پھر پانچ ماہ بعد اسی پہلے الہام کی اسی اخبار کے پرچہ ۳۱ رمئی ۱۹۰۴ء میں دوسرے الہام نے یہ تصریح کی کہ **عفت الدیار محلھا و مقامھا**۔افسوس یہ کیسا زمانہ آ گیا کہ دو جگہ ایک ہی اخبار میں خدا کا کلام موجود ہے

اور ایک کلام دوسرے کی تشریح کرتا ہے۔ اس کی طرف کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور انسانی الفاظ کو پیش کرتے ہیں جس کی غلطی کا الہام الٰہی ذمہ وار نہیں۔ مسلمانوں کی اولاد کہلا کر اس قدر تعصّب۔ خدا جانے اس کا وبال آئندہ کیا ہوگا۔

ماسوا اس کے ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ پیش از وقت کسی پیشگوئی کی پوری حقیقت نہیں کھلتی اور ممکن ہے کہ انسانی تشریح میں غلطی بھی ہو جائے اسی لئے کوئی نبی دُنیا میں ایسا نہیں گذرا جس نے اپنی کسی پیشگوئی کے معنے کرنے میں کبھی غلطی نہ کھائی ہو لیکن اگر قبل از وقت اجتہادی طور پر کوئی نبی اپنی پیشگوئی کے معنے کرنے میں کسی طور کی غلطی کھاوے تو اس پیشگوئی کی شان اور عزّت میں فرق نہیں آئے گا۔ کیونکہ ربّانی پیشگوئی ایک خارق عادت اور ﴿۸۷﴾
انسانی نظر سے بلند اور انسانی خیالات سے برتر ہے۔ کیا آپ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فرق آجاتا ہے اگر یہی حال ہے تو مَیں ایک لمبی فہرست ایسی پیشگوئیوں کی آپ کو دے سکتا ہوں جن کے سمجھنے میں اولوالعزم نبیوں نے غلطی کھائی تھی۔ مگر مَیں یقین رکھتا ہوں کہ آپ بعد اس کے ایسا اعتراض ہرگز نہیں کریں گے اور متنبہ ہو جائیں گے کہ یہ اعتراض کہاں تک پہنچتا ہے صاف ظاہر ہے کہ جب پیشگوئی ظہور میں آجائے اور اپنے ظہور سے اپنے معنے آپ کھول دے اور اُن معنوں کو پیشگوئی کے الفاظ کے آگے رکھ کر بدیہی طور پر معلوم ہو کہ وہی سچے ہیں تو پھر ان میں نکتہ چینی کرنا ایمانداری نہیں ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ الہام مذکورہ بالا کے یہی معنے ہیں کہ ایک حصۂ ملک کی عمارتیں گر جائیں گی۔ پس اس صورت میں یہ الہام اپنے ظاہری معنوں کے رُو سے طاعون پر کیونکر صادق آسکتا ہے۔ اور جس حالت میں ایک حادثہ سے عمارتیں گر گئیں تو وہی حادثہ مصداق اس پیشگوئی کا ہوگا۔ کیا طاعون میں بھی عمارتیں گرا کرتی ہیں۔ پھر ماسوا اس کے اس پیشگوئی سے پہلے الہام میں جو صرف پانچ ماہ پہلے اسی اخبار میں شائع ہو چکا تھا صاف طور پر زلزلہ کا لفظ موجود ہے اور الہامی لفظ یہ ہیں کہ ''زلزلہ کا دھکّا''۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ اُسی اخبار میں ایک آنے والے زلزلہ کی خبر دی گئی ہے۔

اب آپ خود منصف ہو کر سوچ لیں کہ الہام **عفت الدیار محلّها و مقامها** اپنے لفظی معنوں کے رُو سے اس زلزلہ کی پیشگوئی پر چسپاں ہوتا ہے جو پہلے اس سے ذکر بھی کیا گیا یا طاعون پر ماسوا اِس کے زلزلہ کی پیشگوئی کا اس فقرہ سے یعنی **عفت الدیار** کی پیشگوئی سے جیسا کہ معنوں کی رُو سے تعلق ہے ایسا ہی قُرب زمانی کی رُو سے بھی تعلق ہے اور وہ یہ کہ **عفت الدیار** کے الہام سے پانچ ماہ پہلے صریح الفاظ میں زلزلہ کا الہام ہو چکا ہے اور دونوں پیشگوئیاں ایک دوسرے کے بعد شائع ہو چکی ہیں۔ یعنی پہلے ''زلزلہ کا دھکّا'' اور پھر **عفت الدیار محلّها و مقامها** اور ان دونوں کے اندر طاعون کا کوئی ذکر نہیں۔

قولہ۔ اگر الہام **عفت الدیار** الخ کی نسبت قطعی طور پر علم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ زلزلہ کے متعلق ہے تو پھر ایسے الہام سے فائدہ کیا ہوا۔ ﴿۸۸﴾

اقول۔ افسوس آپ کو سنّت اللہ کی کچھ بھی خبر نہیں۔ نبی کے لئے کسی پیشگوئی کے کسی خاص پہلو کا قطعی علم ہونا کہ ضرور اِسی پہلو پر ظاہر ہوگی ضروری نہیں پیشگوئی میں اس بات کا ہونا تو ضروری ہے کہ اس کا مفہوم خارق عادت ہو اور انسانی قوت یا مکر و فریب اس کا مقابلہ نہ کر سکے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک پہلو سے اس پیشگوئی کی حقیقت ظاہر کی جائے۔ توریت میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک ضروری پیشگوئی محض گول مول ہے کہ **ایک نبی موسیٰ کی مانند بنی اسرائیل میں سے اُن کے بھائیوں میں سے آئے گا**۔☆ اور کہیں کھول کر نہ بتلایا کہ بنی اسماعیل میں سے آئے گا۔ اور اس کا یہ نام اور اس کے باپ کا یہ نام ہوگا۔ اور مکّہ میں پیدا ہوگا اور اتنی مدت بعد آئے گا۔ اس لئے یہود کو اس پیشگوئی سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوا۔ اور اسی غلطی سے لاکھوں یہود جہنم میں جا پڑے حالانکہ قرآن شریف نے اسی پیشگوئی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا[1] اور یہود کہتے ہیں کہ

☆ توریت میں بعض جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وہ تم میں سے ہی آئے گا۔ منہ

[1] المزمل:۱۶

مثیل موسیٰ یسوع نبی تھا جو موسیٰ کے فوت ہونے کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ مثیل موسیٰ عیسیٰ ہے کیونکہ وہ بھی موسیٰ کی طرح **منجّی** ہو کر آیا ہے۔ اب بتلاؤ کہ توریت کی ایسی پیشگوئی کا جس نے کوئی صاف فیصلہ نہ کیا، کیا فائدہ ہوا؟ جس نبی علیہ السلام کی نسبت پیشگوئی تھی نہ یہود اس کو شناخت کر سکے نہ عیسائی اور دونوں گروہ سعادت قبول سے محروم رہے مگر وہ وحی الٰہی جو میرے پر نازل ہوئی یعنی **عفت الدیار محلّها و مقامها** یہ جیسا کہ تمہارا خیال ہے مبہم نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے اسی اخبار میں یہ الہام موجود ہے کہ ''زلزلہ کا دھکّا''۔ پھر بعد اس کے یہ دوسری وحی کہ **عفت الدیار محلّها و مقامها** اسی زلزلہ کی صفات بیان کرتی ہے جس کا پہلے اسی اخبار میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور یہ پیشگوئی طاعون پر کسی طرح صادق نہیں آسکتی۔ اور یہ دونوں وحی ایک ہی اخبار میں صرف پانچ ماہ کے فاصلہ کے ساتھ موجود ہیں یعنی الحکم میں۔ اب بتلاؤ کہ کیا یہ ہٹ دھرمی ﴿۸۹﴾ ہے یا نہیں کہ ایسی عظیم الشان پیشگوئی کو جو دو مرتبہ ایک ہی اخبار میں صریح زلزلہ کا نام اور اس کے صفات بیان کر کے اس عظیم الشان حادثہ کی خبر دیتی ہے نکمی اور لغو قرار دی جائے اور اگر یہی بات ہے تو پھر آپ کا اسلام پر قائم رہنا ہی مشکل ہے معتبر تفسیروں میں لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ[1] تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ پیشگوئی کس موقعہ کے متعلق ہے۔ اور پھر جب بدر کی لڑائی میں فتح عظیم ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ اب معلوم ہوا کہ اسی فتح عظیم کی یہ پیشگوئی خبر دیتی تھی اور ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو ایک خوشہ انگور دیا گیا کہ یہ ابوجہل کے لئے ہے اور مَیں حیران تھا کہ ابوجہل کا ایسا خبیث مادہ ہے کہ وہ بہشت میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔ اور کچھ بھی اس کے معنی سمجھ نہ آئے۔ آخر وہ پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی کہ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان ہو گیا اور ایک مرتبہ آپ نے ایک وحی الٰہی کے مطابق مدینہ سے مکہ کی طرف ایک طول طویل سفر کیا۔ اور وحی الٰہی میں یہ بشارت دی گئی تھی کہ مکّہ کے

[1] القمر:۴۶

اندر داخل ہوں گے اور خانہ کعبہ کا طواف کریں گے۔ اور وقت نہیں بتایا گیا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اجتہاد کی بناء پر اُس سفر کی تکلیف اٹھائی۔ اور وہ اجتہاد صحیح نہ نکلا اور مکّہ میں داخل نہ ہو سکے سو اس جگہ پیشگوئی کے سمجھنے میں غلطی ہوئی جس سے بعض صحابہ ابتلا میں پڑ گئے۔

ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے خبر دی تھی کہ تو بادشاہ ہوگا۔ انہوں نے اِس وحی الٰہی سے دنیا کی بادشاہی سمجھ لی۔ اور اسی بنا پر حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کو حکم دیا کہ اپنے کپڑے بیچ کر ہتھیار خرید لو مگر آخر معلوم ہوا کہ یہ حضرت عیسیٰ کی غلط فہمی تھی اور بادشاہت سے مراد آسمانی بادشاہت تھی نہ زمین کی بادشاہت۔ اصل بات یہ ہے کہ پیغمبر بھی بشر ہی ہوتا ہے اور اس کے لئے یہ نقص کی بات نہیں کہ کسی اپنے اجتہاد میں غلطی کھاوے۔ ہاں وہ غلطی پر قائم نہیں رکھا جا سکتا اور کسی وقت اپنی غلطی پر ضرور متنبہ کیا جاتا ہے۔ اور نبی کی پیشگوئی کو ہمیشہ اس کے خارق عادت مفہوم کی رُو سے دیکھنا چاہیئے اور اگر کسی خاص پہلو پر پیشگوئی کا ظہور نہ ہو اور کسی دوسرے پہلو پر ظاہر ہو جائے اور اصل امر جو اس پیشگوئی کا خارق عادت ہونا ہے وہ دوسرے پہلو میں بھی پایا جائے۔ اور واقعہ کے ظہور کے بعد ہر ایک عقلمند کو سمجھ آ جائے کہ یہی صحیح معنے پیشگوئی کے ہیں جو واقعہ نے اپنے ظہور سے آپ کھول دیئے ہیں تو اس پیشگوئی کی عظمت اور وقعت میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔ اور اس پر ناحق نکتہ چینی کرنا شرارت اور بے ایمانی اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے۔ ﴿۹۰﴾

قولہ۔ ایک گول بات کہہ دینی کہ کوئی آفت آنے والی ہے لیکن اس کی کیفیت نہ بتانی کہ کیا آفت ہے اور کب آنے والی ہے پیشگوئی نہیں بلکہ تمسخر ہے اور ہر ایک شخص ایسا کہہ سکتا ہے۔

اقول۔ بجز اس کے کیا کہیں کہ **لعنة اللّٰه علی الکاذبین**۔ ایسے مخالف کو چاہیئے کہ اتنا ہی کہہ دے کہ ایسی آفت نہیں آئے گی۔ اور پھر آپ خود سوچ لیں کہ یہ پیشگوئی گول مول کیسے ہوئی۔ جب کہ صریح اس میں زلزلہ کا نام بھی موجود ہے اور یہ بھی موجود ہے کہ اُس میں

ایک حصہ ملک کا نابود ہو جائے گا۔ اور یہ بھی موجود ہے کہ وہ میری زندگی میں آئے گا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی پیشگوئی ہے کہ وہ ان کے لئے نمونہ قیامت ہوگا جن پر یہ زلزلہ آئے گا۔ اور اگر یہ گول مول ہے تو پھر کھلی کھلی پیشگوئی کس کو کہتے ہیں؟ اور یہ کہنا کہ اُس میں وقت نہیں بتایا گیا یہ صرف آپ اسلام پر نہیں بلکہ تمام آسمانی کتابوں پر حملہ کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں اکثر ایسی ہی پیشگوئیاں ہیں جن میں کوئی وقت نہیں بتایا گیا۔ توریت میں بخت نصر اور طیطوس رومی کی نسبت جو پیشگوئی تھی اس میں کونسا وقت بتایا گیا تھا۔ ایسا ہی توریت میں جو مثیلِ موسیٰ کے آنے کی نسبت پیشگوئی تھی اُس میں کس وقت کی قید لگائی گئی تھی۔ اور انجیل کی پیشگوئیاں جو زلزلوں اور لڑائیوں کے بارے میں ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اُن میں کسی وقت کا پتہ دیا گیا ہے۔ اور پھر وہ پیشگوئی جو مسیح موعود کے آنے کے بارہ میں ہے جس میں آپ لوگ حضرت عیسیٰ بن مریم کو دوبارہ زمین پر لانا چاہتے ہیں اس میں کس وقت کی خدا تعالیٰ نے آپ لوگوں کو خبر دے رکھی ہے تا دور سے آنے والے کے لئے چند قدم استقبال کی نیت سے آپ آگے قدم اٹھاویں اور اگر زیادہ نہیں تو کرہ زمہریر تک ہی پیشوائی کریں اور لحاف وغیرہ ساتھ لے لیں۔ کاش آپ لوگوں نے سوچا ہوتا کہ ایسے اعتراض صرف میرے پر نہیں یہ تو سب اعتراض آپ کے اسلام پر اور نعوذ باللہ قرآن شریف پر پڑتے ہیں بلکہ یہ تو تمام انبیاء گذشتہ پر حملہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ایک پیشگوئی فی نفسہٖ خارق عادت ہو یا کسی ایسے غیب پر مشتمل ہو جس کا علم انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔ اور پیشگوئی میں صاف طور پر یہ دعویٰ ہو کہ ایسا واقعہ اس ملک میں صدہا سال تک کبھی ظہور میں نہیں آیا۔ اور دراصل ظہور میں نہ آیا ہو اور پھر وہ واقعہ اپنے دعوے کے موافق ظہور میں آ جائے تو پھر ایسی خارق عادت پیشگوئی پر اعتراض کرنا بے ایمانوں کا کام ہے جن کو خدا کی اور سچائی کی پروا نہیں اور ایسے بدقسمت ہمیشہ شقاوتِ قلبی کی وجہ سے ہر ایک نبی پر اعتراض کرتے رہے ہیں۔ بھلا آپ ہی بتلاویں کہ اِس زلزلہ کی نسبت جس مدوشد سے پیشگوئی میں ﴿۹۱﴾

خبر دی گئی ہے۔ کیا آپ دو ہزار برس تک اس ملک میں اس کی کوئی نظیر پیش کر سکتے ہیں؟ اور یاد رہے کہ یہ صرف ایک پیشگوئی نہیں بلکہ بار بار میری معرفت میرے خدا نے براہین احمدیہ حصص سابقین میں اس کی خبر دی ہے۔ مواہب الرحمٰن میں اس کی خبر موجود ہے۔ رسالہ آمین میں اس کی خبر موجود ہے اور اخبار الحکم کے کئی پرچوں میں مختلف الہامات میں اس کی خبر موجود ہے۔ پھر بھی آپ کے نزدیک یہ پیشگوئی گول مول ہے۔ اب اس کا کیا علاج اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جن بے جا حملوں کا اسلام پر کرنا غیر مذہب والوں کا کام تھا اب خود مسلمان وہ حملے کرتے ہیں۔ اگر حمایت دین نصیب نہیں تھی تو کم سے کم سوچ کر حملہ کرتے مفت کی روسیاہی اور آخر حملہ میں جھوٹے نکلنا کیا یہ دین داری ہے؟ ع

یکے بر سر شاخ و بُن مے بُرید

اگر اسلامی نور دل میں ہوتا تو خود بخود سمجھ جاتے بلکہ دوسروں کو جواب دیتے۔

قولہ۔ جناب مقدس مرزا صاحب نے دوبارہ زلزلہ آنے کی خبر دی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ مجھے علم نہیں دیا گیا کہ وہ کوئی زلزلہ ہے یا کوئی اور شدید آفت ہے۔ اور مجھے علم نہیں دیا گیا کہ ایسا حادثہ کب ہوگا۔

﴿۹۲﴾ **اقول**۔ میری اس تقریر پر کوئی اعتراض عائد نہیں ہوسکتا کیونکہ قرآن شریف میں جو عربوں کے لئے ایک عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کی کوئی تصریح نہیں کی کہ کس طرح کا عذاب ہوگا اور کس قسم کا ہوگا صرف یہ فرمایا ہے کہ خدا قادر ہے کہ وہ عذاب آسمان سے نازل کرے یا زمین سے بھیجے یا کافروں کو مسلمانوں کی تلوار کا مزہ چکھا دے۔ اب ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اقرار کرتے ہیں کہ مجھے علم نہیں دیا گیا کہ وہ کس قسم کا عذاب ہوگا۔ اور جب پوچھا گیا کہ وہ عذاب کب آئے گا تو آپ نے کوئی تاریخ نہ بتلائی۔ جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا ہے۔ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ [1]

[1] الملک: ۲۶، ۲۷

یعنی کافر پوچھتے ہیں کہ یہ دعویٰ پورا کب ہوگا اگر تم سچے ہو تو تاریخ عذاب بتاؤ۔ ان کو کہہ دے مجھے کوئی تاریخ معلوم نہیں یہ علم خدا کو ہے۔ مَیں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ اور پھر کافروں نے مکرر ًا عذاب کی تاریخ پوچھی تو یہ جواب ملا۔ وَاِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ[1] یعنی ان کو کہہ دے کہ مَیں نہیں جانتا کہ عذاب قریب ہے یا دُور ہے۔ اب اے سُننے والو! یاد رکھو کہ یہ بات سچ ہے اور بالکل سچ ہے اور اس کے ماننے کے بغیر چارہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئیاں کبھی ظاہر پر پوری ہوتی ہیں اور کبھی استعارہ کے رنگ میں۔ پس کسی نبی یا رسول کو یہ حوصلہ نہیں کہ ہر جگہ اور ہر پیشگوئی میں یہ دعویٰ کر دے کہ اس طور پر یہ پیشگوئی پوری ہوگی۔ ہاں البتہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اس امر کا دعویٰ کرنا نبی کا حق ہے کہ وہ پیشگوئی جس کو وہ بیان کرتا ہے خارق عادت ہے یا انسانی علم سے وراء الوراء ہے۔ اگر پنجاب میں ہر صدی میں بھی ایسا زلزلہ آجایا کرتا جیسا کہ ۴؍اپریل ۱۹۰۵ء کو آیا تو اس صورت میں بھی یہ پیشگوئی کچھ بھی چیز نہ ہوتی۔ کیونکہ تمام لوگ اس بات کے کہنے کا حق رکھتے تھے کہ ہمیشہ پنجاب میں ایسے زلزلے آتے ہیں یہ کوئی اَنہونی بات نہیں ہے۔ لیکن جب کہ گذشتہ زلزلہ اس خارق عادت طور سے ظاہر ہوا جس خارق عادت طور سے پیشگوئی نے بیان کیا تھا تو پھر سب اعتراض فضول ہو گئے۔ ایسا ہی آئندہ زلزلہ کی نسبت جو پیشگوئی کی گئی ہے وہ کوئی معمولی پیشگوئی نہیں اگر وہ آخر کو معمولی بات نکلی یا میری زندگی میں اُس کا ظہور نہ ہوا تو مَیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں مجھے خدا تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ آفت جس کا نام اس نے زلزلہ رکھا ہے نمونۂ قیامت ہوگا اور پہلے سے بڑھ کر اس کا ظہور ہوگا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس آئندہ کی پیشگوئی میں بھی پہلی پیشگوئی کی طرح بار بار زلزلہ کا لفظ ہی آیا ہے اور کوئی لفظ نہیں آیا۔ اور ظاہری معنوں کا بہ نسبت تاویلی معنوں کے زیادہ حق ہے لیکن جیسا کہ تمام انبیاء ادبِ ربوبیت اور ادب وسعتِ علم باری ملحوظ رکھتے رہے ہیں اُس اَدب کے لحاظ سے اور سنت اللہ کو مدنظر رکھ کر یہ ﴿۹۳﴾

[1] الانبیآء:۱۱۰

کہنا پڑتا ہے کہ اگرچہ بظاہر لفظ زلزلہ کا آیا ہے مگر ممکن ہے کہ وہ کوئی اور آفت ہو جو زلزلہ کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہو مگر نہایت شدید آفت ہو جو پہلے سے بھی زیادہ تباہی ڈالنے والی ہو جس کا سخت اثر مکانات پر بھی پڑے۔☆ اور یہ پیشگوئی تاریخ اور وقت نہ لکھنے سے باطل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے ساتھ اس قدر اور تصریحات ہیں جو تاریخ اور وقت لکھنے سے مُستغنی کرتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ زلزلہ تیری ہی زندگی میں آئے گا اور اس زلزلہ کے آنے سے تیرے لئے فتح نمایاں ہوگی اور ایک مخلوق کثیر تیری جماعت میں داخل ہو جائے گی۔ اور تیرے لئے وہ آسمانی نشان ہوگا۔ تیری تائید کے لئے خدا خود اُترے گا اور اپنے عجائب کام دکھلائے گا جو کبھی دنیا نے نہیں دیکھے۔ اور دور دور سے لوگ آئیں گے اور تیری جماعت میں داخل ہوں گے۔ اور وہ زلزلہ پہلے زلزلہ سے بڑھ کر ہوگا اور اس میں قیامت کے آثار ظاہر ہوں گے اور دنیا میں ایک انقلاب پیدا کرے گا۔ اور خدا فرماتا ہے کہ مَیں اُس وقت آؤں گا کہ جب دل سخت ہو جائیں گے اور زلزلہ آنے کے خیال سے لوگ اطمینان حاصل کر لیں گے۔ اور خدا فرماتا ہے کہ مَیں مخفی طور پر آؤں گا اور مَیں ایسے وقت میں آؤں گا کہ کسی کو بھی اطلاع نہیں ہوگی۔ یعنی لوگ اپنے دنیا کے کاروبار میں سرگرمی اور اطمینان سے مشغول ہوں گے کہ یکدفعہ وہ آفت نازل ہو جائے گی اور اس سے پہلے لوگ تسلی کر بیٹھے ہوں گے کہ زلزلہ نہیں آئے گا اور اپنے تئیں بے خطر اور امن میں سمجھ لیا ہوگا تب یکدفعہ یہ آفت

☆ مسیح موعود کے بارے میں جو یہودیوں کو پیشگوئی کے طور پر خبر دی گئی تھی کہ وہ نہیں آئے گا جب تک کہ الیاس نبی دوبارہ آسمان سے نازل نہ ہو لے۔ لیکن آسمان سے تو کوئی نازل نہ ہوا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعویٰ کر دیا کہ وہ مسیح موعود مَیں ہوں اور الیاس نبی سے مراد یحییٰ نبی ہے جو مجھ سے پہلے آ چکا۔ پس الیاس نبی کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی جس کے یہود منتظر تھے اور اب تک منتظر ہیں حضرت یحییٰ کے ظہور سے بطور استعارہ پوری ہوگئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پیشگوئیوں میں کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ صَرف عَنِ الظَّاھر کر کے استعارہ کے رنگ میں اپنے وعدہ کو پورا کر دیتا ہے۔ منہ

اُن کے سروں پر ٹوٹے گی۔ مگر خدا فرماتا ہے کہ وہ بہار کے دن ہوں گے۔ آفتاب بہار کی صبح میں نمودار ہوگا اور خزاں کی شام میں غروب کرے گا۔ تب کئی گھروں میں ماتم پڑے گا کیونکہ انہوں نے وقت کو شناخت نہ کیا۔ علم غیب تک کسی نجومی اور کسی طبقات الارض کے علم کے مدعی کو رسائی نہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا مگر خدا جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ اپنی مخلوقات کی تہ سے واقف ہے۔ ﴿۹۴﴾

قولہ ۔ جس حالت میں قرآن شریف میں دونوں زلزلوں کی خبر ہے پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ شاید وہ زلزلہ ہے یا کوئی اور آفت ہے۔

اقول ۔ مَیں نے تو بار بار کہہ دیا کہ ظاہر الفاظ قرآن شریف کے اور اس وحیِ الٰہی کے جو مجھ پر ہوئی زلزلہ کی ہی خبر دیتے ہیں لیکن سنت اللہ ہمیں مجبور کرتی ہے کہ تاویلی احتمال بھی پیشِ نظر رہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ایک قوم کے لئے ایک جگہ فرماتا ہے۔ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا[1] یعنی اُن پر سخت زلزلہ آیا حالانکہ اُن پر کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔ پس دوسری آفت کا نام اس جگہ زلزلہ رکھا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[2] یعنی جو شخص اِس دنیا میں اندھا ہوگا وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا یہ بھی ایک پیشگوئی ہے مگر اس کے وہ معنے نہیں ہیں جو ظاہر الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں۔ وسعتِ علم الٰہی پر ایمان رکھنا اور اپنے علم کو اس کے برابر نہ ٹھہرانا انبیاء اور رسولوں کی صفت ہے۔ قرآن شریف میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کافروں پر فتح پانے کا وعدہ دیا گیا تھا مگر جب بدر کی لڑائی شروع ہوئی جو اسلام کی پہلی لڑائی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونا اور دعا کرنا شروع کیا اور دُعا کرتے کرتے یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ سے نکلے **اَللّٰھم اِن اھلکتَ ھٰذہ العِصابۃ فَلن تُعبد فِی الاَرضِ أَبَدًا** یعنی اے میرے خدا! اگر آج تو نے اس جماعت کو (جو صرف تین سو تیرہ آدمی تھے) ہلاک کر دیا تو پھر قیامت تک کوئی تیری بندگی

[1] الاحزاب :۱۲ [2] بنی اسرآئیل :۷۳

نہیں کرے گا۔ اِن الفاظ کو جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے سنا تو عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس قدر بے قرار کیوں ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے تو آپ کو پختہ وعدہ دے رکھا ہے کہ مَیں فتح دونگا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ سچ ہے مگر اُس کی بے نیازی پر میری نظر ہے۔ یعنی کسی وعدہ کا پورا کرنا خدا تعالیٰ پر حق واجب نہیں ہے۔ ﴿۹۵﴾

اب سمجھنا چاہیے کہ جب کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طریقِ ادب ربوبیت کو اس حد تک ملحوظ رکھا تو پھر اس مسلم عقیدہ جمیع انبیاء علیہم السلام سے کیوں منہ پھیر لیا جائے کہ کبھی خدا تعالیٰ کی پیشگوئی ظاہر الفاظ پر پوری ہوتی ہے اور کبھی بطریق استعارہ اور مجاز پوری ہو جاتی ہے۔ اور اس عقیدہ کا مقابلہ نادانی ہے۔ اور یہ کہنا کہ جس پیشگوئی کے نہ ظاہر الفاظ پر بھروسہ ہے اور نہ اس کا وقت بتایا گیا وہ پیشگوئی کیسے ہوئی؟ یہ سفلی زندگی کا خیال ہے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایسے شخص کو سنت اللہ کی کچھ بھی خبر نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ایک پیشگوئی کوئی عظمت اور قوت اور خارق عادت خبر اپنے اندر رکھتی ہو اور خدا کا ہاتھ صریح طور پر اس میں وقتِ ظہور نظر آجائے تو خود دل اس کو قبول کر لیتے ہیں اور کوئی شخص تاریخ وغیرہ کا ذکر نہیں کرتا۔ دراصل یہ جھگڑا اور یہ اعتراض قبل از وقت ہے۔ وہ وقت تو آنے دو بعد میں اعتراض کرنا۔ قبل از وقت واویلا اچھا نہیں ظہور کے وقت پیشگوئی خود بتا دے گی کہ وہ معمولی بات ہے یا غیر معمولی۔

قولہ ۔ جب کہ بقول آپ کے قرآن شریف میں بھی دو زلزلوں کی خبر ہے تو اب تو آنے والی آفت کے زلزلہ ہونے میں شک کی جگہ نہ رہی۔

اقول ۔ قرآن شریف میں یہ آیت ہے۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ[1] یعنی اس دن زمین ایک سخت اضطرابی حرکت کرے گی اور زمین میں ایک سخت اور شدید اضطراب پیدا ہوگا اور اس کے بعد ایک اور اضطراب زمین میں پیدا ہوگا جو پہلے کے بعد ظہور میں آئے گا۔ اِن آیتوں کے ظاہر الفاظ میں زلزلہ کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ لغت میں رجفان اضطراب شدید کو کہتے ہیں۔ چنانچہ بولا جاتا ہے رَجَفَ الشَّیْءُ یعنی اِضْطَرَبَ اِضْطِرَابًا شَدِیْدًا

[1] النازعات: ۷، ۸

﴿۹۶﴾

مگر چونکہ زمین کا اضطراب اکثر کر کے زلزلہ سے ہی ہوتا ہے اس لئے ہم نے اس جگہ ظن غالب کے طور پر زلزلہ کے معنے کئے ہیں۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ اضطراب کسی اور حادثہ کی وجہ سے ہو زلزلہ کی وجہ سے نہ ہو یا اس اضطراب سے کوئی اور آفت مراد ہو۔ پس اس جگہ بھی وہی بات قائم رہی جو پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ آیت بھی زلزلہ پر **قطعیۃ الدّلالت** نہیں۔ اگرچہ ظن غالب یہی ہے کہ اس جگہ **تَرجف الرَّاجفۃ** سے زلزلہ ہی مراد ہے۔ **واللّٰہ اعلم**۔ ہم نے کب اور کس وقت اپنی پیشگوئیوں کے الفاظ کے یہ معنے کئے ہیں کہ ان سے مراد زلزلہ نہیں ہے بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اکثر اور اغلب طور پر زلزلہ کے لفظ سے مراد زلزلہ ہی ہے مگر ممکن ہے کہ قدیم سنت اللہ کے موافق ان الفاظ سے کوئی اور ایسی شدید اور خارق عادت اور سخت تباہی ڈالنے والی آفت مراد ہو جو زلزلہ کا رنگ اور خاصیت اپنے اندر رکھتی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں استعارات بھی اکثر پائے جاتے ہیں جن سے اہل علم کو انکار نہیں مگر ظاہر الفاظ کا سب سے پہلا حق ہے۔ اور ظاہر الفاظ ان پیشگوئیوں کے زلزلہ پر ہی دلالت کرتے ہیں۔

معترض صاحب نے یہ بار بار سوال کیا ہے کہ پیشگوئی کرنے والے نے نہ زلزلہ کے لفظ کو قطعی طور پر زلزلہ ہی قرار دیا ہے اور نہ وقت بتایا ہے پھر اس صورت میں یہ پیشگوئی کیا ہوئی؟ یوں تو قیامت تک کوئی نہ کوئی حادثہ آ جائے گا اور سہل ہوگا کہ اسی کو اپنی پیشگوئی قرار دے دیں۔

تعجب کہ ہم بار بار کہے جاتے ہیں کہ ظن غالب کے طور پر زلزلہ سے مراد ہماری پیشگوئیوں میں زلزلہ ہی ہے اور اگر وہ نہ ہو تو ایسی خارق عادت آفت مراد ہے جو زلزلہ سے شدید مناسبت رکھتی ہو اور پورے طور پر زلزلہ کا رنگ اس کے اندر موجود ہو پھر بھی معترض صاحب کی اس قدر الفاظ سے تسلی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسے توہمات کے ساتھ ان کی اسلام پر کیونکر تسلی ہوگئی ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشگوئیوں کے

بارے میں اس قدر کافی سمجھا گیا ہے کہ وہ خارق عادت اور انسانی طاقتوں سے بالاتر ہوں یا یہ کہ کسی ایسے غیب پر مشتمل ہوں جو انسانی پیش بینی سے بلند تر ہو۔ جب ایک پیشگوئی خارق عادت کے طور پر بیان کی جائے جس کے بیان کرنے کے وقت کسی عقل اور فہم کو یہ خیال نہ ہو کہ ایسا امر ہونے والا ہے اور صریح وہ ایک غیر معمولی بات ہو جس کی گذشتہ صدہا سال میں کوئی نظیر نہ پائی جائے اور نہ آئندہ اس کے ظہور کے لئے آثار ظاہر ہوں اور وہ پیشگوئی سچی نکلے تو عقلِ سلیم حکم دیتی ہے کہ ایسی پیشگوئی ضرور منجانب اللہ سمجھی جائے گی ورنہ تمام نبیوں کی پیشگوئیوں سے انکار کرنا پڑے گا۔ اب ذرہ کان کھول کر سُن لو کہ آئندہ زلزلہ کی نسبت جو میری پیشگوئی ہے اُس کو ایسا خیال کرنا کہ اُس کے ظہور کی کوئی بھی حد مقرر نہیں کی گئی یہ خیال سراسر غلط ہے کہ جو محض قلّتِ تدبّر اور کثرتِ تعصّب اور جلد بازی سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ بار بار وحیِ الٰہی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ پیشگوئی میری زندگی میں اور میرے ہی ملک میں اور میرے ہی فائدہ کے لئے ظہور میں آئے گی۔ اور اگر وہ صرف معمولی بات ہو جس کی نظیریں آگے پیچھے صدہا موجود ہوں اور اگر کوئی ایسا خارق عادت امر نہ ہو جو قیامت کے آثار ظاہر کرے تو پھر مَیں خود اقرار کرتا ہوں کہ اس کو پیشگوئی مت سمجھو۔ اس کو بقول اپنے تمسخر ہی سمجھ لو۔ اب میری عمر ستّر۷۰ برس کے قریب ہے اور تیس۳۰ برس کی مدت گذر گئی کہ خدا تعالیٰ نے مجھے صریح لفظوں میں اطلاع دی تھی کہ تیری عمر اسّی۸۰ برس کی ہوگی اور یا یہ کہ پانچ۵ چھ۶ سال زیادہ یا پانچ۵ چھ۶ سال کم۔ پس اس صورت میں اگر خدا تعالیٰ نے اس آفت شدیدہ کے ظہور میں بہت ہی تاخیر ڈال دی تو زیادہ سے زیادہ سولہ۱۶ سال ہیں اس سے زیادہ نہیں کیونکہ ضرور ہے کہ یہ حادثہ میری زندگی میں ظہور میں آجائے۔☆ ﴿۹۷﴾

☆ خدا تعالیٰ کا الہام ایک یہ بھی ہے۔ ''پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ موعودہ کے وقت بہار کے دن ہوں گے۔ اور جیسا کہ بعض الہامات سے سمجھا جاتا ہے غالباً وہ صبح کا وقت ہوگا یا اس کے قریب اور غالباً وہ وقت نزدیک ہے جب کہ وہ پیشگوئی ظہور میں آجائے اور ممکن ہے کہ خدا اس میں کچھ تاخیر ڈال دے۔ منہ

لیکن پیشگوئی کا مطلب یہ نہیں کہ پورے سولہ سال تک ظہور اس پیشگوئی کا معرض التوا میں رہے گا بلکہ ممکن ہے کہ آج سے ایک دو سال تک یا اس سے بھی پہلے یہ پیشگوئی ظہور میں آجائے۔ اور نہ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ میری عمر اسّی سال سے ضرور زیادہ ہو جائے گی بلکہ اس بارے میں جو فقرہ وحی الٰہی میں درج ہے اس میں مخفی طور پر ایک امید دلائی گئی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ چاہے تو اسّی برس سے بھی عمر کچھ زیادہ ہو سکتی ہے اور جو ظاہر الفاظ وحی کے وعدہ کے متعلق ہیں وہ تو چہتر اور چھیاسی کے اندر اندر عمر کی تعیین کرتے ہیں۔ بہرحال یہ میرے پر تہمت ہے کہ مَیں نے اس پیشگوئی کے زمانہ کی کوئی بھی تعیین نہیں کی۔ اور خدا تعالیٰ بار بار اپنی وحی میں فرما رہا ہے کہ ہم تیرے لئے یہ نشان دکھلائیں گے۔ اور ان کو کہہ دے کہ یہ نشان میری سچائی کا گواہ ہوگا۔ مَیں تیرے لئے اُتروں گا اور تیرے لئے اپنے نشان دکھلاؤں گا۔ مَیں اُس وقت تیرے پاس اپنی فوجیں لے کر آؤں گا جب کہ کسی کو خبر نہیں ہوگی اور اس وقت کو کوئی نہیں جانتا مگر خدا۔ اور جیسا کہ موسیٰ کے زمانہ میں ہوا کہ فرعون اور ہامان اُس وقت تک دھوکا میں رہے جب تک کہ رود نیل کے طوفان نے ان کو پکڑا ایسا ہی اب بھی ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ تو میری آنکھوں کے سامنے کشتی طیار کر اور ظالم لوگوں کی سفارش مت کر۔ اور اُن کا شفیع مت بَن کہ مَیں اُن سب کو غرق کروں گا۔ ایسا ہی اور صریح الہاماتِ الٰہی ہیں اور سب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ پیشگوئی میری زندگی میں اور میرے ہی زمانہ میں ظہور میں آئے گی اور اس کی یہ حدّ ہے جو معیّن اور مقرر ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتی۔ مگر نہیں معلوم کہ وہ مہینوں کے بعد ظہور میں آئے گی یا ہفتوں کے بعد یا برسوں کے بعد۔ بہرحال وہ سولہ سال سے تجاوز نہیں کرے گی۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسا کہ استنباط آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی عمر حضرت آدم سے لے کر سات ہزار سال ہے۔ اور اس میں سے ہمارے زمانہ تک چھ ہزار برس گذر چکے ہیں۔ جیسا کہ اعداد سورۃ والعصر سے معلوم ہوتا ہے۔ اور بموجب حساب قمری کے اب ہم ساتویں ہزار میں ہیں۔ اور ﴿۹۸﴾

جو مسیح موعود چھٹے ہزار کے اخیر پر قائم ہونا تھا وہ قائم ہو چکا ہے☆ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ قیامت کی گھڑی معلوم نہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا نے قیامت کے بارے میں انسان کو کوئی اجمالی علم بھی نہیں دیا ورنہ قیامت کے علامات بھی بیان کرنا ایک لغو کام ہو جاتا ہے کیونکہ جس چیز کو خدا تعالیٰ اس طرح پر مخفی رکھنا چاہتا ہے اُس کے علامات بیان کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے بلکہ ایسی آیات سے مطلب یہ ہے کہ قیامت کی خاص گھڑی تو کسی کو معلوم نہیں مگر خدا نے حمل کے دنوں کی طرح انسانوں کو اس قدر علم دے دیا ہے کہ ساتویں ہزار کے گذرنے تک اِس زمین کے باشندوں پر قیامت آجائے گی۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے ﴿۹۹﴾

☆ خدا نے آدم کو چھٹے دن بروز جمعہ بوقت عصر پیدا کیا۔ توریت اور قرآن اور احادیث سے یہی ثابت ہے اور خدا نے انسانوں کے لئے سات دن مقرر کئے ہیں۔ اور اِن دنوں کے مقابل پر خدا کا ہر ایک دن ہزار سال کا ہے۔ اس کی رو سے استنباط کیا گیا ہے کہ آدم سے عمر دنیا کی سات ہزار سال ہے اور چھٹا ہزار جو چھٹے دن کے مقابل پر ہے وہ آدمِ ثانی کے ظہور کا دن ہے۔ یعنی مقدر یوں ہے کہ چھٹے ہزار کے اندر دینداری کی روح دنیا سے مفقود ہو جائے گی اور لوگ سخت غافل اور بے دین ہو جائیں گے۔ تب انسان کے روحانی سلسلہ کو قائم کرنے کے لئے مسیح موعود آئے گا۔ اور وہ پہلے آدم کی طرح ہزار ششم کے اخیر میں جو خدا کا چھٹا دن ہے ظاہر ہوگا۔ چنانچہ وہ ظاہر ہو چکا اور وہ وہی ہے جو اس وقت اس تحریر کی رو سے تبلیغ حق کر رہا ہے۔ میرا نام آدم رکھنے سے اس جگہ یہ مقصود ہے کہ نوع انسان کا فرد کامل آدم سے ہی شروع ہوا اور آدم سے ہی ختم ہوا کیونکہ اس عالم کی وضع دَوری ہے اور دائرہ کا کمال اسی میں ہے کہ جس نقطہ سے شروع ہوا ہے اُسی نقطہ پر ختم ہو جائے۔ پس خاتم الخلفاء کا آدم نام رکھنا ضروری تھا اور اسی وجہ سے جیسا کہ آدم توام پیدا ہوا تھا میری پیدائش بھی توام ہے اور جس طرح آدم جمعہ کے روز پیدا ہوا تھا میں بھی جمعہ کے دن ہی پیدا ہوا تھا اور جس طرح آدم کی نسبت فرشتوں نے اعتراض کیا میری نسبت بھی وہ وحی الٰہی نازل ہوئی جو یہ ہے۔ **قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا. قال انی اعلم ما لا تعلمون**۔ اور جس طرح آدم کے لئے سجدہ کا حکم ہوا۔ میری نسبت بھی وحی الٰہی میں یہ پیشگوئی ہے۔ **یَخِرُّون علی الاذقان سُجَّدًا ربّنا اغْفِرلنا اِنّا کُنّا خاطئین. منه**

کہ ہر ایک انسان کا بچہ جو پیٹ میں ہو نو۹ ماہ اور دس۱۰ دن تک ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن تا ہم اُس کے پیدا ہونے کی گھڑی خاص معلوم نہیں۔ اِسی طرح قیامت بھی سات ہزار برس تک آجائے گی۔ مگر اُس کے آنے کی گھڑی خاص معلوم نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سات ہزار پورا ہونے کے بعد دو۲ تین۳ صدیاں بطور کسور کے زیادہ ہو جائیں جو شمار میں نہیں آسکتیں۔

اور معترض کا یہ دوسرا اعتراض کہ یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ درحقیقت زلزلہ ہے۔ یہ اعتراض بھی قلت فہم سے ناشی ہوا ہے کیونکہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ظاہر الفاظ وحی سے زلزلہ ہی معلوم ہوتا ہے اور اغلب اکثر یہی ہے کہ وہ زلزلہ ہے اور پہلا زلزلہ اس پر شہادت بھی دیتا ہے اور قرآن شریف کی یہ آیت بھی اس کی مؤید ہے کہ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ[1]☆۔ مگر تا ہم خدا تعالیٰ کی کتابیں بھی اِس طرف ہمیں توجہ دلاتی ہیں کہ کبھی ایسی پیشگوئیاں استعارہ کے طور پر بھی پوری ہوتی ہیں مگر خارق عادت ہونے کا رنگ اور غیر معمولی حادثہ ہونے کا رنگ اُن میں باقی رہتا ہے اور ہماری رائے تو یہی ہے کہ ننو۹۰ میں سے نوّے وجوہ تو یہی بتلاتی ہیں کہ حقیقت میں وہ زلزلہ ہے نہ اور کچھ۔ کیونکہ اس میں زمین کی جنبش اور عمارتوں کے منہدم ہونے کا بھی ذکر ہے یہ تو ہمارا اجتہاد ہے اور بعد اس کے خدا تعالیٰ کے اسرار مخفی کو خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے اور ممکن ہے کہ آگے چل کر وہ اس سے زیادہ ہم پر کھول دے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آپ کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی پیشگوئیوں میں جن زلزلوں کا ذکر کیا تھا اُن کی انہوں نے کوئی تاویل نہیں کی اس لئے وہ پیشگوئیاں ایک تعین اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ آپ کا عجیب قول ہے اور عجیب رائے۔ ظاہر ہے کہ ان پیشگوئیوں میں حضرت عیسیٰ نے کسی ہولناک اور مہلک اور خارق عادت زلزلہ کا ذکر نہیں کیا۔ جس ملک میں حضرت عیسیٰ

☆ اُس دن زمین سخت حرکت اضطرابی کرے گی۔ اور اس کے بعد ایک اور حرکت اضطرابی ہوگی یعنی قیامت کے نزدیک دو۲ سخت زلزلے آئیں گے۔ پہلے کے بعد دوسرا زلزلہ آئے گا۔ منہ

[1] النازعات: ۷، ۸

رہتے تھے اس ملک میں شاذ و نادر کوئی ایسا سال گذرتا ہوگا کہ زلزلہ نہ آتا ہو۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس ملک میں ہمیشہ زلزلے آتے رہے ہیں اور سخت زلزلے بھی آتے رہے ہیں ﴿۱۰۰﴾ حضرت عیسیٰ نے اپنی زندگی میں جب وہ اُس ملک میں تھے اور ابھی کشمیر کی طرف سفر نہیں کیا تھا☆ کئی زلزلے خود دیکھے ہوں گے۔ پس مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ ان معمولی حوادث کا نام پیشگوئی کیوں رکھا جائے۔ پس جس تمسخر کو آپ نے میری پیشگوئیوں میں تلاش کرنا چاہا اور نامراد رہے اگر آپ حضرت عیسیٰ کی ان پیشگوئیوں میں تلاش کرتے تو بغیر کسی محنت کے فی الفور آپ کو مل جاتا۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے زلزلہ کا نام زلزلہ ہی رکھا کوئی تاویل نہیں کی۔ کیا آپ مجھے حضرت عیسیٰ کا کوئی ایسا فقرہ دکھلا سکتے ہیں جس میں لکھا ہو کہ اِن پیشگوئیوں میں زلزلے سے مراد درحقیقت زلزلہ ہے کوئی استعارہ نہیں۔ اور بغیر حضرت عیسیٰ کی

☆ حاشیہ۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر جانا محض گپ ہے بلکہ وہ صلیب سے بچ کر پوشیدہ طور پر ایران اور افغانستان کا سیر کرتے ہوئے کشمیر میں پہنچے اور ایک لمبی عمر وہاں بسر کی۔ آخر فوت ہو کر سری نگر محلّہ خانیار میں مدفون ہوئے اور اب تک آپ کی وہیں قبر ہے۔ یُـزَارُ وَ یُتَبَرَّکُ بِہٖ اور صلیب پر آپ فوت نہیں ہوئے۔ کچھ زخم بدن پر آئے تھے جن کا مرہم عیسیٰ کے ساتھ علاج کیا گیا تھا۔ اور اس مرہم کا نام اسی وجہ سے مرہم عیسیٰ رکھا ۞ گیا۔ منہ

۞ جس طرح ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کی لڑائی میں مجروح ہوئے تھے اور کئی زخم تلواروں کے پیشانی مبارک پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آئے تھے اور سر تا پا خون سے آلود ہو گئے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بہت کم حضرت عیسیٰ کو صلیب پر زخم آئے تھے پھر نہ معلوم نادان لوگوں کو حضرت عیسیٰ سے کیسی مشرکانہ محبت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم تو قبول کر لیتے ہیں مگر حضرت عیسیٰ کا مجروح اور زخمی ہونا ان کی شان سے بلند تر سمجھتے ہیں اور شور ڈالتے ہیں کہ ان کی نسبت ایسا کیوں کہتے ہو اور ان کو تمام دنیا سے الگ ایک خصوصیت دینا چاہتے ہیں۔ وہی آسمان پر چڑھ کر پھر زمین پر اترنے والے۔ وہی اس قدر لمبی عمر پانے والے۔ مگر خدا نے ان کو پیدائش میں بھی اکیلا نہیں رکھا بلکہ کئی حقیقی بھائی اور کئی حقیقی بہنیں ان کی ایک ہی ماں سے تھیں۔ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اکیلے تھے۔ نہ کوئی دوسرا بھائی تھا نہ بہن۔ منہ

سند کے صرف آپ کا قول کیونکر قبول کیا جائے کیونکہ حضرت عیسیٰ کی پیشگوئیوں پر نظر ڈال کر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ سب کی سب استعارہ کے رنگ میں ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے دعویٰ کیا تھا کہ میں یہود کا بادشاہ ہوں اور اس دعویٰ پر روم کی گورنمنٹ میں مُخبری ہوئی کہ یہود تو سلطنت رومیہ کے ماتحت ہیں مگر یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ یہود میری رعایا ہیں اور مَیں ان کا بادشاہ ہوں۔ اس پر جب گورنمنٹ رومی نے جواب طلب کیا تو آپ نے فرمایا کہ میری بادشاہی اس جہان کی نہیں بلکہ بادشاہی سے مراد آسمان کی بادشاہت ہے۔ اب دیکھئے کہ ابتدا میں خود حضرت عیسیٰ کا خیال تھا کہ مجھے زمین کی بادشاہت ملے گی اور اسی خیال پر ہتھیار بھی خریدے گئے تھے مگر آخر کار وہ آسمان کی بادشاہت نکلی۔ پس کیا بعید ہے کہ زلزلہ سے مراد بھی اُن کی کوئی آسمانی امر ہی ہو۔ ورنہ زمین شام میں تو ہمیشہ زلزلے آتے ہی ہیں ایسی زمین کے متعلق زلزلہ کی پیشگوئی کرنا ایک مخالف کی نظر میں تمسخر کی جگہ ہے۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ میرے بارہ ۱۲ حواری بارہ ۱۲ تختوں پر بہشت میں بیٹھیں گے۔ یہ پیشگوئی بھی انجیل میں موجود ہے مگر ایک اُن حواریوں میں سے یعنی یہودا اسکریوطی مرتد ہو کر مر گیا۔ اب بتلاؤ کہ بارہ ۱۲ تختوں کی پیشگوئی کس طرح صحیح ہو سکتی ہے اگر کوئی جوڑ توڑ آپ کر سکتے ہیں تو ہمیں بھی سمجھا دیں ہم ممنون ہوں گے یہاں تو کسی استعارہ کی بھی کچھ پیش نہیں جاتی۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ اس زمانہ کے لوگ ابھی گذر نہیں جائیں گے کہ میں واپس آؤں گا۔ پس جو لوگ ان کو آسمان پر چڑھائے بیٹھے ہیں کیا نصاریٰ اور کیا مسلمان۔ اس بات کا جواب اُن کے ذمہ ہے کہ اُنیس ۱۹ صدیاں تو گذر گئیں مگر ابھی تک حضرت عیسیٰ واپس نہیں آئے اور اُنیس ۱۹ صدیوں تک جو لوگ عمریں پوری کر چکے تھے وہ سب خاک میں مل گئے لیکن اب تک کسی نے حضرت عیسیٰ کو آسمان سے اُترتے نہ دیکھا۔ پھر وہ وعدہ کہاں گیا کہ اس زمانہ کے لوگ ابھی زندہ ہوں گے کہ مَیں واپس آجاؤں گا۔ غرض ایسی پیشگوئیوں پر جس نے ناز کرنا ہے بیشک کرے ہم تو قرآن شریف ﴿۱۰۱﴾

کے فرمودہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کو سچا نبی مانتے ہیں ورنہ اس انجیل کی رُو سے جو موجود ہے اُن کی نبوت کی بھی خیر نہیں۔ عیسائی تو ان کی خدائی کو روتے ہیں مگر ہمیں ان کی نبوت ہی ثابت کرنا بجز ذریعہ قرآن شریف کے ایک غیر ممکن امر معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ عیسائی صاحبوں نے انجیل کی کچھ ایسی ہڈی پسلی توڑی ہے کہ اب اُس کی بُری بھلی بات کا کچھ بھی اعتماد نہیں رہا لیکن تحریف کے قبول کرنے کے بعد بھی حضرت عیسیٰ کی زلزلہ والی پیشگوئی مسلمانوں کے نزدیک سرے سے قابل اعتماد نہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ کی اس پیشگوئی کا کچھ بھی ذکر نہیں۔ پس کیونکر اور کس ذریعہ سے اس کو صحیح مان لیا جائے۔ افسوس کہ جس قدر آپ نے میری پیشگوئیوں کے ردّ میں ہاتھ پیر مارے ہیں اور خدا ترسی کو چھوڑ کر ناخنوں تک کوشش کی ہے کہ کسی طرح پبلک کی نظر میں اِن پیشگوئیوں کو آپ خفیف ثابت کر دیں یہ گناہِ بے لذت آپ نے مفت میں خرید لیا اگر دلائل کے توڑنے میں کچھ کامیابی ہوتی تو اور نہیں تو عیسائیوں کی نظر میں ہی آپ قابل تحسین ٹھہرتے۔ خاموشی میں بھی ایک سعادت تھی زبان کھول کر کیا لیا اور آپ نے میرے پر یہ حملہ نہیں کیا ہے بلکہ اُس خدا پر حملہ کیا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ افسوس کہ صرف سخت دلی اور شہرت کی خواہش نے اکثر لوگوں کو میرے مخالف کھڑا کیا ہے ورنہ میرے دعویٰ اور میرے دلائل کا سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ہزار ہا نشان اب تک ظاہر ہو چکے اور زمین و آسمان نے بھی گواہی دی مگر جن کے دلوں پر مہریں ہیں وہ مخالفت سے باز نہ آئے۔ انہوں نے خدا سے ایک عذاب مانگا ہے جو وقت پر آئے گا۔ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کا مقابلہ کر رہے ہیں اگر وہ اس سے پہلے مر جاتے تو اُن کے لئے بہتر تھا مگر تعصب اور خود بینی کی شراب نے ان کو مست کر رکھا ہے اور وہ دن آتے ہیں کہ خدا اُن کو ہوش میں لائے گا۔ ﴿۱۰۲﴾

اب ہم چند شبہات مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی کو جو انہوں نے پرچہ پیسہ اخبار ۱۹؍جون ۱۹۰۵ء میں چھپوائے ہیں اس جگہ رفع دفع کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

قولہ ۔وہ لکھتا ہے (یعنی یہ عاجز) کہ میں نے براہین احمدیہ میں اس زلزلہ کی خبر دی تھی اور لکھا تھا کہ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ یہ ایسا جھوٹ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

اقول ۔کیا آپ کو اس بات میں کچھ شک ہے کہ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۶ میں یہ عبارت موجود ہے **فلمّا تجلّٰی ربّہ للجبل جعلہ دکًّا. واللّٰہ موھن کید الکافرین ولنجعلہٗ اٰیۃً للناس و رحمۃً منّا و کان اَمْرًا مَّقْضِیًّا** یعنی جب اس عاجز کا ربّ ایک پہاڑ مخصوص پر تجلّی کرے گا تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ اور خدا منکروں کے مکر کو سُست کر دے گا اور ہم پہاڑ کے اس واقعہ کو لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں گے اور مومنوں کے لئے یہ رحمت کا موجب ہوگا اور یہ امر ابتدا سے فیصلہ شدہ تھا یعنی پہلے نبیوں نے خبر دی تھی کہ مسیح موعود کے وقت میں ایسے ہولناک زلزلے آئیں گے۔ ایسا ہی پھر مَیں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو اس بات میں کچھ شک ہے کہ براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۷ میں اسی واقعہ کے متعلق یہ دوسری وحی الٰہی ہے **فلمّا تجلّی ربّہٗ للجبل جعلہٗ دکًّا. قوۃ الرحمٰن لعُبید اللّٰہ الصمد**۔ (ترجمہ) جب اس کا (یعنی اس عاجز کا) ربّ پہاڑ پر تجلی کرے گا تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا یہ خدا کی قوت سے ہوگا اپنے بندہ کی تائید میں یعنی اس کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے۔

اب جب کہ یہ دونوں عبارتیں براہین احمدیہ میں موجود ہیں اور اُن میں صریح لفظوں میں یہ وعدہ بھی ہے کہ خدا نشان دکھائے گا اور نصرت اور تائید کرے گا۔ پھر اس بارے میں جو کچھ اشتہار میں لکھا گیا سفید جھوٹ کیونکر ہو گیا۔ کیا پہاڑ کے پھٹ جانے کو زلزلہ پر دلالت التزامی نہیں؟ اور کیا صاف طرح پر اس جگہ یہ وعدہ نہیں کہ ہم پہاڑ کے پھٹ جانے کو اپنے اس بندہ کے لئے نشان بنائیں گے اور یہ واقعہ تائید اور نصرتِ الٰہی پر دلالت کرے گا اور کیا تصریح کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور الفاظ ہو سکتے ہیں جو صفحہ ۵۱۶ میں فرمایا گیا **ولنجعلہ اٰیۃ للنّاس** یعنی ہم پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا واقعہ لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں گے۔ ایسا ہی اس سے بڑھ کر اور کیا تصریح ہو سکتی ہے جو براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۵۷ میں کی گئی ہے ﴿۱۰۳﴾

کیونکہ پہلے پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا وعدہ کیا اور پھر فرمایا **قوّۃ الرحمٰن لِعُبَید اللّٰہ الصمد**۔ یعنی یہ خدا کی قوت سے ہوگا۔ اُس کے بندہ کی تائید اور نصرت کے لئے جس شخص نے اب بھی باوجود اِن تصریحات کے ایسی واضح پیشگوئی کو سفید جھوٹ سمجھا ہے اس کی نسبت بجز اس کے کیا کہیں کہ خود اُس کی آنکھیں سفید ہوگئی ہیں کہ روز روشن کو وہ رات خیال کرتا ہے۔ علاوہ اس کے جس موقعہ پر قرآن شریف میں یہ آیت ہے وہ موقعہ بھی تو زلزلہ پر ہی دلالت کرتا ہے کیونکہ اب تک توریت سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کہ حضرت موسیٰ کو کرشمۂ قدرت دکھلانے کے لئے پہاڑ پھٹا تھا اس وقت بھی زلزلہ ہی آیا تھا۔ اس قدر شہادتوں کے بعد بھی اگر کوئی نہیں مانتا تو دو۲ حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس کے حواس میں خلل ہے اور آنکھ کی بینائی میں قصور اور یا سخت تعصب کے پردہ نے اس کو اس توفیق سے محروم کر دیا ہے کہ وہ نور کو دیکھ کر پھر اس کو قبول کر سکے۔ ماسوائے اس کے ہر ایک عقلمند جانتا ہے کہ پہاڑ کا پھٹ جانا بھی مستلزم زلزلہ ہے اور اس واقعہ کو زلزلہ پر قطعی اور ضروری دلالت ہے تو پھر کیونکر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ زلزلہ کا اس جگہ کچھ بھی ذکر نہیں۔ کیا پہاڑ زلزلہ کے بغیر بھی پھٹا کرتے ہیں؟ مولوی صاحب کی عقل پر یہ کیسے پتھر پڑ گئے کہ کھلی کھلی بات اُن کو سمجھ نہیں آتی۔ ستّر برس تک پہنچ کر پھر طفولیت کی سادہ لوحی ظاہر ہونے لگی۔ پھر ساتھ اس کے جب کہ یہ بھی موجود ہے کہ اس واقعہ کو ہم نشان بنائیں گے اور اس مامور کی اس سے تائید اور نصرت کریں گے تو بجز ایسے شخص کے کہ اس کے دل پر شقاوت کا زنگ جم گیا ہو۔ کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ پہاڑ کا پھٹنا جس کا براہین احمدیہ میں ذکر ہے کوئی ایسا واقعہ ہے جس کو خدا اپنے مامور کے لئے نشان بنائے گا۔ جیسا کہ اُسی جگہ بطور وعدہ اُس نے فرمایا ہے **ولنجعلہ اٰیۃً لِّلنّاس**۔ یعنی ہم اس کو لوگوں کے لئے نشان بنائیں گے۔ ﴿۱۰۴﴾

قولہ۔ گورنمنٹ اور پبلک براہین احمدیہ کے صفحات مذکورہ کو ملاحظہ کریں کیا یہ عبارت کہیں پائی جاتی ہے۔ اس دھوکا بازی اور جعلسازی کی کوئی انتہا نہیں۔

۱ قول ۔اِس دلیری اور شوخی اور مُنہ زوری کے مقابل پر ہم بجز اس کے کیا لکھ سکتے ہیں کہ **لعنة اللّٰہ علی الکاذبین** ۔بندۂ خدا آخر کبھی مرنا ہے۔کبھی تو اُس گھڑی کا خیال کرو جب جان کندن کا غرغرہ شروع ہوگا۔کیا یہ دونوں عربی عبارتیں جن کا مَیں نے اپنے اشتہار میں حوالہ دیا ہے براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۶ اور ۵۵۷ میں موجود نہیں ہیں اِس قدر جھوٹ اور یہ عمر۔ براہین احمدیہ دنیا میں پھیل چکی ہے صرف آپ کی بغل میں نہیں۔ پھر اس شوخی اور شرارت سے فائدہ کیا۔کیا یہ سچ نہیں کہ ان آیتوں میں پہاڑ پھٹ جانے کا ذکر ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ اسی الہام میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم پہاڑ کا پھٹ جانا لوگوں کے لئے نشان بنائیں گے اور بعض کے لئے یہ نشان رحمت کا موجب ہوگا اور کیا یہ سچ نہیں کہ ان الہامات میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نشان اپنے بندہ کی تائید اور نصرت کے لئے ظاہر کریں گے؟ اور کیا یہ سچ نہیں کہ جو الہام صفحہ ۵۵۷ براہین احمدیہ میں عربی میں ہے اس کے سر پر اردو میں یہ الہام ہے۔**دنیا میں ایک نذیر آیا پر دنیا نے اس کو قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا**۔☆ کیا ان تمام عبارتوں کو یکجائی نظر سے دیکھنے سے ثابت نہیں ہوتا کہ پہاڑ کا پھٹنا جو براہین احمدیہ میں لکھا گیا ہے اس کے ساتھ ہی کتاب موصوف میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ یہ ایک پیشگوئی ہے۔ ہاں

☆ خدا تعالیٰ کی پہلی کتابوں میں بعض پیشگوئیاں اسی پیشگوئی کے ہم معنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہیں جن میں لکھا ہے کہ یہودی ان کو قبول نہیں کریں گے جیسا کہ انجیل میں بھی انہیں پیشگوئیوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونہ کا سرا ہوا یعنی اسرائیلی نبیوں کا خاتم الانبیاء ہوا۔سو انہیں پیشگوئیوں کے مطابق یہ پیشگوئی ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ لوگوں نے تو اُس کو قبول نہ کیا مگر میں قبول کروں گا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دوں گا۔سو ضروری ہے کہ یہ دنیا ختم نہ ہو جب تک یہ تمام باتیں ظہور میں آ جائیں۔اور جیسا کہ انجیل میں ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونہ کا سرا ہوا۔اِسی طرح خدا نے مجھے فرمایا کہ وہ تو تجھے رد کرتے ہیں مگر میں تجھے خاتم الخلفاء بناؤں گا۔ اس بارے میں وحی الٰہی کئی مختلف عبارتوں میں ہے اگر سب لکھی جائیں تو طول ہوگا۔منہ

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ قبل از وقت ہم براہین احمدیہ کی اس پیشگوئی کو متعیّن نہیں کر سکے کہ کس پہلو پر یہ ظاہر ہوگی۔ اور یہ ایک ایسا امر ہے جس میں تمام انبیاء شریک ہیں مگر مَیں نے نہ براہین احمدیہ میں اور نہ کسی اور کتاب میں اس بات سے انکار کیا ہے کہ یہ پیشگوئی ہے اور کیونکر ﴿۱۰۵﴾ انکار کرسکتا وہاں تو صاف صفحہ ۵۱۶ براہین احمدیہ میں لکھا ہے **ولنجعله اٰيةً لِّلنّاس و رحمةً منّا** کہ ہم پہاڑ کا پھٹ جانا لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں گے۔ اور پھر صفحہ ۵۵۷ میں صاف لکھا ہے **قوّة الرحمٰن لعُبَيد الله الصمد** یعنی پہاڑ کا پھٹ جانا خدا کی قوت سے ہوگا اپنے بندہ کی تائید کے لئے۔ پس اس جگہ بجز کسی شریر خبیث آدمی کے جس کو ایمان اور خدا اور روز جزاء کی کچھ بھی پروا نہ ہو کون اس بات کا انکار کرسکتا ہے کہ یہ پیشگوئی ہے اور اس میں ایک نشان کا وعدہ ہے۔ اور جب کہ خدا تعالیٰ نے اس کا نام نشان رکھا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ کسی وقت ہم اس کو لوگوں کے فائدہ کے لئے ظاہر کریں گے تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ یہ نشان نہیں اور یہ پیشگوئی نہیں۔ اور ہمارا یہ اقرار کہ ہم براہین احمدیہ کے زمانہ میں اس پیشگوئی کو کسی پہلو پر متعین نہیں کرسکتے اس سے مخالف کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ نبی کے لئے قبل از وقت ہر ایک پیشگوئی کا متعین کرنا ضروری نہیں اور یہ بحث اسی کتاب میں ہم پہلے بہت کر چکے ہیں ضرورت نہیں کہ ہم بار بار اس کو لکھیں۔ اگر در خانہ کس است حرفے بس است۔

قولہ۔ ان تینوں فقروں میں کرشن قادیانی نے جھوٹ بولا ہے۔ یعنی ایک فقرہ گذشتہ بالا جس کا جواب ہو چکا ہے اور دوسرے یہ کہنا کہ زلزلہ سے پیچھے بار بار خیال آیا کہ مَیں نے بڑا گناہ کیا☆ کہ جیسا کہ شائع کرنے کا حق تھا زلزلہ کی پیشگوئی کو شائع نہ کیا۔ اور تیسرے یہ کہنا کہ اگرچہ مَیں اس وقت جانتا تھا کہ میرا لکھنا دلوں کو ایک واجبی احتیاط کی طرف مصروف نہیں کرے گا تاہم اس غم نے میرے دل کو گھیرا کہ جو خبر مجھ کو خدائے علیم وحکیم سے ملی تھی اُس کی میں نے پورے طور سے اشاعت نہ کی۔

☆ مولوی محمد حسین صاحب نے اس میرے فقرہ پر بہت خوشی سے بغلیں بجائی ہیں کہ مجھے بار بار خیال آیا کہ

﴿۱۰۶﴾

اقول ۔ بدظنی ایسی چیز ہے کہ اُس کا کوئی علاج نہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص کو اِس بات کا علم دیا جائے کہ فلاں تباہی کسی گروہ پر آنے والی ہے اور وہ اس قوم کو اُس تباہی سے جیسا کہ چاہیے متنبہ نہ کر سکے اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی یقین ہو کہ میرا کہنا نہ کہنا ان کو برابر ہوگا مگر پھر بھی اس تباہی کے بعد ضرور اس کے دل کو صدمہ پہنچے گا کہ کاش وہ لوگ میری آواز کو سنتے اور بچ جاتے۔ مَیں خیال کرتا ہوں کہ یہ خاصیت ہر ایک دل میں ہے مگر ممکن ہے کہ اس زمانہ کے بعض مولویوں کے دل ایسے ہوں کہ خدا نے یہ خاصیت ان میں سے سلب کر لی ہو۔ اور اگر یہ وہم گذرے کہ کیونکر یقین کریں کہ صاحبِ الہام کو یقین ہو گیا تھا کہ الہام **عفت الدیار محلّها و مقامها** سے مراد زلزلہ ہے۔ اس کا جواب ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک ایسا صاف الہام ہے کہ اس کے معنوں پر اطلاع پانے سے ایک بچہ کو بھی یقین ہو سکتا ہے کہ یہ ایک سخت حادثہ کی پیشگوئی ہے جس کا اثر عمارتوں پر ہوگا۔ اور اس سے ایک سال پانچ مہینہ پہلے الحکم اخبار میں

بقیہ حاشیہ

میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ مولوی کہلا کر ان کو یہ معلوم نہیں کہ انسان کا کمالِ معرفت اسی میں ہے کہ انسان اپنے رب جلیل کے آگے ہر ایک وقت اپنے تئیں قصوروار ٹھہراوے یہ نبیوں کی سنت ہے وہ شیطان ہے جو خدا تعالیٰ کے سامنے انکسار اختیار نہ کرے نبی جو روتے چلاتے نعرے مارتے رہے۔ یہ سوز و گداز اسی وجہ سے تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے گناہ کیا کہ جیسا کہ حق تبلیغ کا تھا ہم سے ادا نہ ہو سکا۔ اپنے آقا و مولیٰ کے سامنے تمام سعادت اِسی میں ہے کہ اِس قصور کا اقرار کریں۔ چنانچہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام استغفار اسی بنا پر ہے کہ آپ بہت ہی ڈرتے تھے کہ جو خدمت مجھے سپرد کی گئی ہے یعنی تبلیغ کی خدمت اور خدا کی راہ میں جانفشانی کی خدمت اس کو جیسا کہ اس کا حق تھا میں ادا نہیں کر سکا۔ اور اس خدمت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی نے ادا نہیں کیا۔ مگر خوفِ عظمت اور ہیبت الٰہی آپ کے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ اسی لئے دوام استغفار آپ کا شغل تھا۔ توریت میں بھی ہے ''تب موسیٰ نے جلدی سے زمین پر سر جھکایا اور بولا کہ اے خداوند..... ہمارے گناہ اور خطائیں معاف کر'' خروج ۳۴-۹۔ ساؤل نبی کہتا ہے۔ ''میں نے گناہ کیا کہ میں نے خداوند کے فرمان کو ٹال دیا''۔ دیکھو ا۔ سموئیل ۱۵-۲۵۔ داؤد نبی خدا تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میں نے تیرا گناہ کیا۔ دیکھو زبور ۵۱-۴۔ منہ

یعنی اخیر دسمبر ۱۹۰۳ء کے پرچہ میں صاف لفظوں میں زلزلہ کی پیشگوئی موجود ہے۔ اور پھر مواہب الرحمٰن مطبوعہ ۱۹۰۲ء میں بھی یہی زلزلہ کی پیشگوئی موجود ہے۔ اور پھر رسالہ آمین مطبوعہ ۱۹۰۱ء میں بھی یہی زلزلہ کی پیشگوئی موجود ہے۔ پھر باوجود اس قدر تواتر کے کیونکر کوئی عقلمند خیال کرسکتا ہے کہ ہم اس پیشگوئی سے بالکل بے خبر تھے۔ ہاں مَیں جیسا کہ میرا مذہب ہے بار بار یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ پیشگوئیوں میں قطعی طور پر یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ ضرور ان کا ایک ہی خاص پہلو پر ظہور ہوگا ممکن ہے کہ خدائے علیم وحکیم کوئی دوسرا پہلو اُن کے ظہور کے لئے اختیار کرے جس میں وہی عظمت اور قوت اور ہولناک صورت پائی جائے جس پر پیشگوئی دلالت کرتی ہو۔

پھر جب کہ مجھ کو پیشگوئی **عفت الدیار محلها و مقامها** کی عظمت اور شدت پر پورا پورا یقین تھا اور مَیں اس کو پورے ایمان سے خدا تعالیٰ کا کلام سمجھتا تھا اور اس کے ظہور نے مجھ پر کھول دیا تھا کہ جیسا کہ پیشگوئی کے ظاہری الفاظ تھے اسی طرح وہ وقوع میں بھی آ گئی تو کیا وہ وقت نہیں تھا کہ بنی نوع کے لئے میری ہمدردی جوش مارتی اور میں کوشش کرتا کہ آئندہ زلزلہ سے بچنے کے لئے لوگ توبہ اور استغفار اور کسی احسن انتظام کی طرف متوجہ ہوں۔ کیا مَیں نے یہ بُرا کام کیا کہ جس بلا کا مجھے یقین دیا گیا تھا اس بلا سے بچنے کے لئے مَیں نے لوگوں کو مطلع کر دیا۔ اور کیا انسان میں یہ طبعی امر نہیں ہے کہ کسی بلا پر اطلاع پا کر بنی نوع کی ہمدردی کے لئے اس کا دل جوش مارتا ہے۔ ہاں بعض قصّاب طبع لوگ ہوتے ہیں کہ ان کو دوسرے کے درد اور مصیبت کی کچھ بھی پروا نہیں ہوتی۔ سو میں ایسے لوگوں کو انسان نہیں سمجھتا۔

﴿۱۰۷﴾ **قولہ** ۔ لہٰذا اُس سے (یعنی مجھ سے) یہ حماقت عمل میں آئی جو اپنے تئیں ایک بڑے گناہ کا مرتکب مان لیا جس سے اپنے اصلی دعویٰ نبوت کی جڑ کاٹ دی۔

اقول ۔ یہودیوں کی طرح آپ جس قدر چاہیں تحریف کریں ہم آپ کو کیا کہہ سکتے ہیں

ورنہ جو لوگ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں وہ باوجود نبی اور رسول ہونے کے اقرار رکھتے ہیں کہ جیسا کہ حق تبلیغ کا تھا ادا نہ کر سکے☆ اور اسی کو وہ گناہِ عظیم خیال کرتے ہیں اور اسی خیال سے وہ نعرے مارتے اور روتے اور درد سے بھر جاتے ہیں اور دائم الاستغفار رہتے ہیں مگر خشک مولوی جن کے دامن میں بجز ہڈیوں کے کچھ نہیں وہ اس روحانیت کو کیا جانتے ہیں۔ بے گناہ ہونے کی اطمینان کسی نبی نے بھی ظاہر نہیں کی۔ جو دنیا میں افضل الرسل اور خاتم الرسل گذرا ہے اس کے منہ سے بھی یہی نکلا **ربنا اغفرلنا ذنوبنا و باعد بيننا و بين خطايانا** اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فرماتے تھے کہ سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ اور آپ سب سے زیادہ استغفار پڑھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مَیں دن میں ستّر مرتبہ استغفار کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ نے آپ کے حق میں فرمایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا[1]۔ یہ سورۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب زمانۂ وفات میں نازل ہوئی تھی اور اس میں اللہ تعالیٰ زور دے کر اپنی نصرت اور تائید اور تکمیل مقاصد دین کی خبر دیتا ہے کہ اب تو اے نبی خدا کی تسبیح اور تمجید کر اور خدا سے مغفرت چاہ وہ تـوّاب ہے اس موقعہ پر مغفرت کا ذکر کرنا یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب کام تبلیغ ختم ہو گیا خدا سے دُعا کر کہ اگر خدمت تبلیغ کے دقائق میں کوئی فروگذاشت ہوئی ہو تو خدا اُس کو بخش دے۔ موسیٰ بھی توریت میں اپنے قصوروں کو یاد کر کے روتا ہے اور جس کو عیسائیوں نے خدا بنا رکھا ہے کسی نے اس کو کہا۔ کہ اے نیک اُستاد۔ تو اُس نے جواب دیا کہ تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے نیک کوئی نہیں مگر خدا۔ یہی تمام اولیاء کا شعار رہا ہے۔ سب نے استغفار کو اپنا شعار قرار دیا ہے بجز شیطان کے ؎

فرس کشتہ چنداں کہ شب راندہ اند سحر گہ خروشاں کہ واماندہ اند

☆ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **ما عبدناک حقّ عبادتک** یعنی اے ہمارے خدا جو حق تیری پرستش کا تھا ہم سے ادا نہیں ہو سکا۔ کیا آپ اس جگہ یہ اعتراض کریں گے کہ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود عبادت کرنے میں قاصر تھے تو دوسروں کو کیوں نصیحت کرتے تھے۔ افسوس۔ منہ

[1] النصر: ۲ تا ۴

﴿۱۰۸﴾

قولہ۔ وہ (یعنی یہ عاجز) براہین احمدیہ کی پیشگوئی کو سچا بنانے اور اس پر زلزلہ کا رنگ چڑھانے اور اس ذریعہ سے اپنی غیب دانی اور نبوت کا سکہ جمانے کی غرض سے اس بات کا مدعی ہوگیا ہے کہ براہین احمدیہ کی پیشگوئی سے مجھے بہت صفائی سے خدا کی طرف سے یہ خبر مل چکی تھی کہ اِس سے زلزلہ مراد ہے تاہم مَیں نے قوم کی بدگوئی اور بدظنی کے خوف سے اُس کو چھپایا اور عربی کا ترجمہ اردو میں کر کے شائع نہ کیا۔ اور مَیں اس فعل سے خدا کے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا اور پچیس۲۵ برس تک اِسی گناہ پر قائم اور مُصِر رہا۔

اقول ۔ مولوی صاحب آج آپ نے تحریف کرنے میں یہودیوں کے بھی کان کاٹے۔ مولوی کہلانا اور اس قدر صریح عبارت کے معنے بیان کرنے میں عمداً خیانت کرنا کیا یہ ان لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو یوم الحساب پر ایمان لاتے ہیں۔ مَیں نے اپنے اشتہار میں کب اور کہاں لکھا ہے کہ مَیں پچیس۲۵ برس تک اس گناہ پر قائم اور مُصِر رہا کہ براہین احمدیہ کے عربی الہام کا ترجمہ شائع نہ کیا۔ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۶ اور صفحہ ۵۵۷ کھول کر دیکھو دونوں مقام میں عربی الہامات کا ترجمہ موجود ہے۔ پھر مَیں کیونکر کہہ سکتا تھا کہ مَیں نے عربی الہام کا ترجمہ اردو میں کر کے شائع نہ کیا اور پچیس۲۵ برس تک اِسی گناہ پر قائم اور مُصِر رہا۔ کیا کوئی عقلمند باور کرسکتا ہے کہ باوجودیکہ ان دونوں الہامات کا جو صفحہ ۵۱۶ اور صفحہ ۵۵۷ براہین احمدیہ میں درج ہیں ساتھ ہی ترجمہ اردو میں لکھا ہوا ہے۔ پھر مَیں اشتہار میں یہ لکھتا کہ ان الہامات کا ترجمہ براہین احمدیہ میں مَیں نے نہیں لکھا۔ بلکہ یہ ذکر تو میرے اشتہار ۱۱؍مئی ۱۹۰۵ء میں اس عربی الہام کے متعلق تھا جو الحکم ۳۱؍مئی ۱۹۰۴ء میں بغیر ترجمہ کے شائع کیا گیا تھا یعنی الہام **عفت الدیار محلّها و مقامها** جس کا ترجمہ اردو میں نہیں لکھا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے اس غرض سے یہ تحریف کی تا میرے پر یہ الزام قائم کریں کہ گویا مَیں نے عمداً پچیس۲۵ برس تک براہین احمدیہ کے عربی الہام کا ترجمہ نہ کیا اور مخفی رکھا۔

ماسوا اس کے زلزلہ کے متعلق تو براہین احمدیہ میں دو۲ پیشگوئیاں تھیں۔ ایک

﴿۱۰۹﴾

صفحہ ۵۱۶ میں درج تھی اور دوسری صفحہ ۵۵۷ میں درج تھی۔ اور میرے اشتہار ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء میں صرف ایک پیشگوئی کی نسبت لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا۔ پس اگر اس جگہ اشتہار ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء میں براہین احمدیہ کی وہ دو۲ پیشگوئیاں مراد ہیں تو اس میں یہ عبارت نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ عربی پیشگوئی کا ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ عبارت ہونی چاہیئے تھی کہ عربی دو پیشگوئیوں کا ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر بھی ایسا لکھنا جھوٹ ہوتا کیونکہ دونوں عربی پیشگوئیوں کا ترجمہ براہین احمدیہ میں موجود ہے جو شخص چاہے دیکھ لے۔

پھر علاوہ اس کے وہ اشتہار مورخہ ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء جس پر مولوی صاحب یہ نکتہ چینی کرتے ہیں ابھی دنیا سے گم نہیں ہو گیا بہتوں کے پاس موجود ہوگا۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے اُس زلزلہ کے بعد مجھے بار بار خیال آیا کہ مَیں نے بڑا گناہ کیا کہ جیسا کہ حق شائع کرنے کا تھا اس پیشگوئی کو شائع نہ کیا کیونکہ وہ پیشگوئی صرف اردو کے دو۲ اخبار اور دو۲ رسالوں میں شائع ہوئی تھی اور یہ بھی فروگذاشت ہوئی تھی کہ عربی پیشگوئی کا ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ براہین احمدیہ کی عربی پیشگوئیاں جو صفحہ ۵۱۶ اور صفحہ ۵۵۷ میں درج ہیں نہ اردو دو۲ اخباروں میں شائع ہوئیں اور نہ ان کا ترجمہ کرنا رہ گیا اور نہ کسی اور رسالہ میں ان کا ذکر ہوا بلکہ وہ پیشگوئی جو دو۲ اردو اخباروں میں درج ہوئی تھی اور جس کا عربی سے اردو میں ترجمہ نہیں ہوا تھا وہ یہی پیشگوئی **عفت الدیار محلّها و مقامها** ہے۔ کیونکہ وہ علاوہ دو۲ اخباروں کے جن میں سے ایک الحکم ۳۱ر مئی ۱۹۰۵ء ہے دو۲ رسالوں میں بھی درج ہو چکی تھی یعنی اُس کو مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے نے اپنے دونوں رسالوں میں ۲۰ر مارچ ۱۹۰۴ء کو شائع کر دیا تھا۔ چنانچہ حاشیہ میں ان کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا نوٹ درج ہے۔☆ اب ذرا آنکھ کھول کر

☆ سیّدی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ یہ الہام **عفت الدیار محلها و مقامها** ۔ مارچ کے دونوں رسالوں میں شائع ہو چکا تھا اور رسالہ کے صفحہ ۱۲۶ میں درج ہے۔ اسی الہام کو پڑھ کر اور پھر زلزلہ کی خبر اخباروں میں پڑھ کر چارلس سورائٹ عبدالحق نے جو اس وقت نیوزی لینڈ میں تھا خط لکھا تھا۔ جس میں زلزلہ کے ذریعہ سے اس الہام کے پورا ہونے پر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ (محمد علی)

﴿۱۱۰﴾ اوّل آپ مولوی صاحب موصوف کے نوٹ کو پڑھ لیں اور پھر ندامت میں غرق ہو جائیں اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بندۂ خدا اس قدر چالاکی تو وہ یہود بھی نہیں کرتے ہوں گے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ[1] پ۶۔ پھر آپ نے اپنی مولویت کا یہ نمونہ کیسا دکھلایا؟ مَیں نہیں خیال کرسکتا کہ آپ ایسے نادان تھے جنہوں نے کمال سادہ لوحی سے عبارت کے سمجھنے میں غلطی کھائی۔ آپ براہین احمدیہ کا ریویو لکھ چکے تھے۔ اور آپ کو خوب معلوم تھا کہ براہین احمدیہ کے وہ عربی الہامات جن کا مَیں نے اپنے اشتہار میں ذکر کیا ہے وہ بغیر ترجمہ کے نہیں لکھے گئے اور آپ کو خوب معلوم تھا کہ براہین احمدیہ کے اِن عربی الہامات کا ذکر نہ تو ہمارے سِلسلہ کے اِن دو۲ اخباروں الحکم اور البدر میں کیا گیا ہے اور نہ ایسے دو۲ رسالے ہمارے سِلسلہ میں کسی نے تالیف کئے جن میں براہین احمدیہ کے ان الہامات کا کچھ ذکر ہو۔ پھر جب کہ براہین احمدیہ کے ان الہاماتِ عربیہ کا براہین احمدیہ میں ترجمہ موجود ہے اور نہ کسی اخبار اور نہ کسی رسالہ میں ان کا ذکر ہے اور نہ وہ صرف ایک پیشگوئی ہے تا اشتہار ۱۱؍مئی ۱۹۰۵ء کی یہ عبارت اس پر منطبق ہو سکے کہ عربی پیشگوئی کا ترجمہ بھی نہیں ہوا تھا بلکہ وہ دو پیشگوئیاں ہیں تو اس صورت میں شرعاً آپ سے مطالبہ ہے کہ آپ نے اس قدر جھوٹ کیوں بولا؟ شائد جو کرم دین کے مقدمہ میں میرے مقابل پر مولویوں نے دروغ مصلحت آمیز کے جواز کا فتویٰ دیا تھا اس پر آپ نے بھی عمل کیا۔ بہرحال آپ بتلاؤ کہ کیوں آپ نے وہ ذکر جو الہام **عفت الدّیار محلّها و مقامها** کی نسبت تھا براہین احمدیہ کے اُن دو۲ عربی الہاموں پر مڑھ دیا جو صفحہ ۵۱۶ اور صفحہ ۵۵۷ براہین احمدیہ میں موجود ہے کیا آپ لوگوں کی یہی مولویانہ حیثیت میں دیانت اور امانت ہے کہ آپ نے ایسا افترا کیا اور کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف آپ کے دل میں نہ آیا۔ اور صرف اِسی پر بس نہیں بلکہ آپ محض شرارت اور چالاکی سے اپنے اس مضمون میں اپنی طرف سے ایک عبارت لکھتے ہیں اور پھر پبلک پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ گویا وہ عبارت جو آپ نے میری طرف منسوب

[1] المآئدۃ:۱۴

کی ہے درحقیقت میرے ہی قلم سے نکلی ہے۔ چنانچہ وہ عبارت جو آپ نے محض جعلسازی سے میری طرف منسوب کر دی ہے وہ یہ ہے۔ ’’براہین احمدیہ کی پیشگوئی سے مجھے بہت صفائی سے خدا کی طرف سے یہ خبر مل چکی تھی کہ اس سے زلزلہ مراد ہے تاہم مَیں نے قوم کی بدگوئی اور بدظنی کے خوف سے اُس کو چھپایا اور عربی کا ترجمہ اردو میں کر کے شائع نہ کیا۔ اور مَیں اس فعل سے خدا کے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔ اور پچیس۲۵ برس تک اِسی گناہ پر قائم اور مُصِر رہا‘‘۔ اے مفتری نابکار کیا اب بھی ہم نہ کہیں کہ جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ جس نے آپ عبارت بنا کر میری طرف منسوب کر دی۔ اے سخت دل ظالم تجھے **مولوی کہلا کر شرم نہ آئی کہ تو نے ناحق اس قدر میرے پر جھوٹ بولا۔ کیا تو دکھلا سکتا ہے کہ میرے اشتہار ۱۱ر مئی ۱۹۰۵ء میں یا کسی اور اشتہار میں یا کسی رسالہ میں یہ عبارت موجود ہے جو تو نے لکھی! لعنة اللّٰہ علی الکاذبین۔**

﴿۱۱۱﴾

اِس جگہ اُن لوگوں کو متنبہ رہنا چاہیے کہ جو ایسے لوگوں کو مولوی اور دیانتدار سمجھ کر اُن کے قول پر عمل کرنے کو طیار ہوتے ہیں۔ یہ حال ہے ان لوگوں کی دیانت کا اور جھوٹے کے کلام میں تناقض ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف کا یہ بیان بھی تناقض سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اخبار مذکور کے صفحہ پانچ۵ کالم تیسرے۳ میں پندرھویں۱۵ سطر و چوبیسویں۲۴ سطر میں میرے اشتہار کی عبارت یہ لکھتے ہیں کہ ’’مَیں نے براہین احمدیہ میں اِس زلزلہ کی خبر دی تھی اور اگرچہ اُس وقت اس خارق عادت بات کی طرف ذہن منتقل نہ ہو سکا لیکن اب اِن پیشگوئیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ آنے والے زلزلہ کی نسبت تھیں جو اُس وقت نظر سے مخفی رہ گئیں‘‘۔

اب ناظرین خود دیکھ لیں کہ اس عبارت مذکورہ بالا کا یہی مطلب ہے کہ اُس زمانہ میں کہ جب براہین احمدیہ کے لکھنے کا زمانہ تھا ذہن اس طرف منتقل نہ ہو سکا کہ زلزلہ سے مراد درحقیقت زلزلہ ہے اور یہ امر اُس وقت نظر سے مخفی رہا اور اب پچیس۲۵ برس

کے بعد جب زلزلہ ظہور میں آ گیا تو اب معلوم ہوا کہ وہ براہین احمدیہ کی پیشگوئیاں آئندہ آنے والے زلزلہ کی نسبت پیشگوئیاں تھیں۔

یہ تو میری طرف سے انہوں نے اقرار لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ مَیں نے اپنے اشتہار النداء من وحی السّمآء میں جو اپریل ۱۹۰۵ء کو شائع ہوا تھا درحقیقت یہ عبارت اشتہار کے صفحہ ۷ مطبوعہ نول کشور پریس لاہور میں لکھی ہے چنانچہ پوری عبارت یہ ہے۔ ﴿۱۱۲﴾

''یاد رہے کہ ان دونوں زلزلوں کا ذکر میری کتاب براہین احمدیہ میں بھی موجود ہے جو آج سے پچیس ۲۵ برس پہلے اکثر ممالک میں شائع کی گئی تھی۔ اگرچہ اس وقت اس خارق عادت بات کی طرف ذہن منتقل نہ ہو سکا لیکن اب ان پیشگوئیوں پر نظر ڈالنے سے بدیہی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آئندہ آنے والے زلزلوں کی نسبت پیشگوئیاں تھیں جو اُس وقت نظر سے مخفی رہ گئیں''۔

اب ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ مَیں نے اس اشتہار میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ میرا اس وقت سے پہلے جب کہ زلزلہ ۴؍اپریل ۱۹۰۵ء ظہور میں آ گیا اس بات کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا تھا کہ جیسا کہ ظاہر الفاظ پہاڑ کے پھٹ جانے سے سمجھا جاتا ہے درحقیقت براہین احمدیہ کے ان الہامات سے زلزلہ ہی مراد ہے اور اس پر ایک دلیل بھی ہے کہ براہین احمدیہ میں جو اِن دونوں الہامات کا ترجمہ کیا گیا ہے اُس میں بھی ظاہر الفاظ کی رُو سے ترجمہ نہیں ہوا۔ غرض میں نے اس اشتہار ۲۱؍اپریل ۱۹۰۵ء میں جو ۴؍اپریل ۱۹۰۵ء کے بعد لکھا تھا صاف اقرار کر دیا کہ مَیں پچیس ۲۵ برس تک براہین احمدیہ کے دونوں موقعہ کے الہام کو جو **فلمّا تجلّٰی ربّہٗ للجبل** ہے خاص زلزلہ کے لئے متعین نہ کر سکا۔ مگر ۴؍اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے بعد کھل گیا کہ وہ اسی زلزلہ کے متعلق تھا۔ یہ تو وہ امر ہے جو میرے اشتہار ۲۱؍اپریل ۱۹۰۵ء سے ثابت ہوتا ہے۔

اب اس اشتہار کے برخلاف جو دعویٰ محض افترا اور جعلسازی سے مولوی محمد حسین صاحب نے

میری طرف منسوب کیا ہے اور اپنی طرف سے ایک عبارت بنا کر میری طرف منسوب کی ہے وہ عبارت پھر ہم دوبارہ لکھ دیتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے ''براہین احمدیہ کی پیشگوئی سے مجھے بہت صفائی سے خدا کی طرف سے یہ خبر مل چکی تھی کہ اس سے زلزلہ مراد ہے تاہم مَیں نے قوم کی بدگوئی اور بدظنی کے خوف سے اس کو چھپایا۔ اور عربی کا ترجمہ اُردو میں کر کے شائع نہ کیا۔ اور مَیں اس فعل سے خدا کے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا اور پچیس ۲۵ برس تک اِسی گناہ پر قائم اور مُصر رہا''۔

﴿۱۱۳﴾ اب ناظرین انصافاً فرماویں کہ کیا یہ بیان جو مولوی صاحب موصوف نے میری طرف منسوب کیا ہے یہ میرے اشتہار ۲۱؍اپریل ۱۹۰۵ء کی عبارت کے مخالف ہے یا نہیں جس کو ابھی مَیں نے نقل کر دیا ہے کیونکہ مَیں اشتہار مذکور میں صاف طور پر لکھ چکا ہوں کہ اُس اشتہار سے پہلے جو براہین احمدیہ سے پچیس ۲۵ برس بعد مَیں نے ۱۱؍مئی ۱۹۰۵ء کو شائع کیا ہے اس بات کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا تھا کہ زلزلہ سے مراد درحقیقت ظاہری طور پر زلزلہ ہے بلکہ پچیس ۲۵ برس بعد زلزلہ کے آنے پر ان الہامات کے معنے کھلے۔

پس جب کہ یہ دونوں بیانات متناقض ہیں اور مَیں اُن میں سے صرف ایک بیان کو قبول کرتا ہوں جو مولوی صاحب کے اس مضمون میں بھی انہیں کے ہاتھ سے درج ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہ مَیں پچیس ۲۵ برس تک براہین احمدیہ کے الہام صفحہ ۵۱۶ اور صفحہ ۵۵۷ کو کسی ایک پہلو پر متعین نہ کر سکا تو اس میں کیا شک ہے کہ دوسرا بیان اُس وقت تک محض مولوی صاحب کا افترا سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ میری کسی کتاب یا اشتہار میں سے یہ ثابت کر کے نہ دکھلا دیں کہ یہ عبارت مذکورہ مَیں نے کسی جگہ لکھی ہے اور یا کسی جگہ مَیں نے یہ لکھا ہے کہ پچیس ۲۵ برس تک اس گناہ پر قائم اور مُصِر رہا کہ باوجودیکہ براہین احمدیہ کے زمانہ سے قطعی علم زلزلہ کے متعلق مجھے ہو چکا تھا پھر مَیں نے اس خبر کو مخفی رکھا۔

اب اے ناظرین برائے خدا اپنی موت کو یاد کر کے ایماناً مجھے بتلاؤ کہ جو شخص اس قدر افترا کرتا

اور جھوٹی عبارتیں بنا کر میری طرف منسوب کرتا ہے کیا وہ کسی سرزنش اور تعزیر شرعی کے لائق ہے یا نہیں۔ بیّنوا توجروا۔ اور یہ بھی محض لِلّٰہ فرماویں کہ کیا ایسا شخص جو اس طرح کی شوخی سے جعلسازی کرتا ہے اس لائق ہے کہ آئندہ اس کو مولوی کے نام سے پکارا جائے۔ اور کیا مناسب نہیں کہ ایک مجلس علماء مقرر کر کے اس کو بلایا جاوے اور اس سے پوچھا جاوے کہ یہ فرضی عبارت جو میری طرف اُس نے منسوب کی ہے مَیں نے کس کتاب یا رسالہ میں اس کو لکھا ہے۔ مولوی کہلا کر یہ افترا ورایہ تحریف اور یہ خیانت اور یہ جھوٹ اور یہ دلیری اور یہ شوخی اِن باتوں کا تصور کر کے بدن کانپتا ہے۔ کیا مجھے کافر اور بے ایمان کہنے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث جس میں کہ لکھا ہے کہ آخری زمانہ کے اکثر مولوی یہودیوں کے مولویوں سے مشابہت پیدا کر لیں گے یاد نہیں رکھتے بلکہ اس سے بڑھ کر بعض حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ اس قدر مشابہت پیدا کریں گے کہ اگر کسی یہودی نے ماں سے بھی زنا کیا ہوگا تو وہ بھی کر لیں گے۔ ☆ ﴿۱۱۴﴾

☆ آخری زمانہ کے وہ علماء جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اس امت کے قرار دیا ہے وہ بالخصوص اسی قسم کے مولوی ہیں جو مسیح موعود کے مخالف اور جانی دشمن اور اس کی تباہی کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور اس کو کافر اور بے ایمان اور دجال کہتے ہیں اور اگر ان کے لیے ممکن ہو تو اس کو صلیب دینے کے لئے طیار ہیں کیونکہ یہود کے فقیہ اور فریسی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اسی طرح پیش آئے تھے اور ان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جو علماء اس قسم کے نہیں ہیں ان کو ہم اس امت کے یہودی نہیں کہہ سکتے بلکہ جو لوگ حضرت عیسیٰ کے دشمنوں کی طرح مجھے دجال اور کافر اور بے ایمان کہتے ہیں وہی یہودی ہیں اور میں ان کو یہودی نہیں کہتا بلکہ خدا تعالیٰ کا کلام ان کو یہودی کہتا ہے اور یہ تو امر مجبوری ہے۔ جس حالت میں درحقیقت مَیں سچا ہوں نہ کافر نہ دجال نہ بے ایمان ہوں۔ پس جو شخص سچے مسیح کو ایسے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہودی قرار دیتے ہیں۔ اگر مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب مجھے بے ایمان کافر دجّال قرار نہیں دیتے اور واجب القتل نہیں سمجھتے تو ہم ان کو یہودی نہیں کہتے اور اگر وہ مجھے ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور خدا جانتا ہے کہ میں سچا مسیح موعود ہوں تو اس صورت میں وہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا مصداق بن کر اپنے تئیں یہودی بناتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ تم کیوں عیسیٰ بنے۔ اس کا یہی جواب ہے کہ آپ لوگوں کے طفیل سے۔ اگر آپ یہودی نہ بنتے تو میرا نام یہ نہ ہوتا۔ منہ

اور باوجود اس کے کہ بٹالوی صاحب نے اس قدر جھوٹ بول کر اور خیانت اور تحریف کر کے مجھے دکھ دیا ہے پھر بھی اگر وہ میری کسی کتاب میں وہ عبارت جو انہوں نے میری طرف منسوب کی ہے اور لکھا ہے کہ گویا میں پچیس۲۵ برس تک اسی گناہ پر قائم اور مُصِر رہا دکھلا دیں تو مَیں نقد پچاس۵۰ روپیہ اُن کو دے سکتا ہوں۔ ورنہ میری طرف سے یہ کلمہ کافی ہے کہ **لعنة اللّٰه علی الکاذبین**۔

قولہ۔ کسی سچے نبی یا ملہم کے نشان نہیں ہیں کہ جس بات کی تبلیغ کا خدا اُس کو حکم دے وہ دانستہ اور عمداً پچیس۲۵ برس تک چھپائے رکھے اور اُس کی تبلیغ نہ کرے۔

اقول۔ اس افترا کا جواب گذر گیا اور مَیں بیان کر چکا ہوں کہ مَیں نے کسی اشتہار میں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ براہین احمدیہ کی یہ دو۲ پیشگوئیاں جو لکھی گئی ہیں یعنی **فلمّا تجلّٰی ربّه للجبل جعلهٗ دکًّا** اُن کے اصل منشاء کی طرف اسی زمانہ میں میرا ذہن منتقل ہو گیا تھا بلکہ بار بار لکھ چکا ہوں کہ پچیس۲۵ برس کے بعد ان معنوں کی حقیقت کھلی۔ اور اگر پہلے سے میرے پر حقیقت کھلتی تو پھر اس الہام کے اس ترجمہ میں جو براہین احمدیہ میں لکھا گیا کیوں غلطی وقوع میں آتی۔

پھر اس نادان مولوی کے اِس قول پر مجھے تعجب آتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ سچے نبی یا ملہم کا یہ نشان نہیں ہے کہ جس بات کی تبلیغ کا خدا اس کو حکم دے وہ دانستہ اور عمداً پچیس۲۵ برس تک اس کو چھپائے رکھے۔ اس نادان کو اب تک یہ بھی معلوم نہیں کہ تبلیغ الٰہی احکام کے متعلق ہوتی ہے نہ ایسی پیشگوئیوں کے متعلق۔ جن کی اشاعت کے لئے ملہم مامور بھی نہیں بلکہ اختیار رکھتا ہے چاہے ان کو شائع کرے یا نہ کرے۔ ماسوا اس کے جب کہ اس پیشگوئی کی حقیقت ابھی میرے پر نہیں کھلی تھی تو اس بات کے لئے میں مکلّف نہ تھا کہ اس کے معنے اور مقصد لوگوں پر ظاہر کرتا اور جس قدر اجتہادی طور پر میرے خیال میں گذرا مَیں نے ترجمہ ان پیشگوئیوں کا براہین احمدیہ میں شائع کر دیا۔ پس مَیں نے تبلیغ میں کونسا قصور کیا ﴿۱۱۵﴾

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا[1] اگر یہ بات ہوتی کہ براہین احمدیہ کی اُن پیشگوئیوں کی وہ حقیقت جو ۴؍اپریل ۱۹۰۵ء کے زلزلہ کے بعد میرے پر کھل گئی براہین احمدیہ کی اشاعت کے زمانہ میں ہی مجھے معلوم ہوتی تو اگرچہ مَیں اس کی اشاعت کے لئے مامور نہ تھا تاہم میں نوع انسان کی ہمدردی کے لئے جہاں تک مجھ سے ممکن ہوتا اس کی اصل حقیقت سے لوگوں کو اطلاع دیتا۔

قولہ ۔ یہ عجیب عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کہ پیشگوئیوں کے معنے سمجھنے میں عوام تو عوام انبیاء علیہم السلام بھی اجتہاد کے وقت غلطی کر بیٹھتے ہیں۔

اقول ۔انہیں باتوں سے تو آپ کا خیانت پیشہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔مَیں خوب جانتا ہوں کہ آپ شیر خوار بچہ نہیں آپ علم حدیث سے ایسے جاہل نہیں جن کو اوّل نمبر کے جاہل کہنا چاہیے۔ آپ ایسے مجنون نہیں جن کے حواس بالکل قائم نہیں ہوتے۔تو پھر یہ خیانت ہے یا کوئی اور بات ہے کہ آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے کوئی غلطی اجتہادی طور پر نہیں ہوسکتی سب جانتے ہیں کہ بیشک غلطی ہوسکتی ہے۔مگر وہ ہمیشہ اس غلطی پر قائم نہیں رکھے جاسکتے۔ مَیں اس بارے میں بھی اسی ضمیمہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قولہ ۔کسی پیشگوئی کے جھوٹے ہونے کا الزام جب آپ پر قائم ہوتا ہے تو اس الزام کو اسی اصول سے اٹھا دیا جاتا ہے۔

اقول ۔اے مولوی صاحب خدا آپ کو ہدایت کرے اور وہ دن لاوے کہ آپ کی آنکھیں کھلیں۔آپ اس شخص کی طرح جس کی گردن کے پیچھے بہت بڑا پھوڑا ہو اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ زمین کی طرف جھکا رہے آسمان کی طرف نظر نہ اٹھا سکے آسمانی انوار سے محروم ہیں اور اُن سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔اب تک دس ہزار سے بھی زیادہ خدا تعالیٰ میری تائید میں نشان ظاہر کر چکا ہے جو روز روشن کی طرح پورے ہو گئے ہیں مگر آپ کے نزدیک ہر ایک پیشگوئی جھوٹی نکلتی رہی ہے اور گویا میں جھوٹ کو سچ بنانے ﴿۱۱۶﴾

[1] البقرۃ:۲۸۷

کے لئے تاویلیں کرتا رہا ہوں۔ اب اس جگہ بھی میں بجز اس کے کیا کہوں کہ لعنة اللّٰہ علی الکاذبین۔ جو شخص میری صحبت میں چالیس دن بھی رہتا ہے وہ کوئی نہ کوئی خدا تعالیٰ کا نشان دیکھ لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہزار ہا بندگانِ خدا اس طرف جُھک گئے ہیں اور باوجود آپ کے بُغض اور بُخل اور ہمیشہ کی یاوہ گوئی کے ایک عالم ہماری طرف آ گیا ہے اور آتا جاتا ہے اور آپ کے مُنہ کی پھونکوں سے کچھ بھی بگڑ نہ سکا۔ آسمان میں خدا نے میرے لئے خسوف کسوف کیا مگر آپ کے نزدیک وہ حدیث غلط ہے۔ اور مَیں چودھویں صدی کے سر پر آیا اور بفضلہٖ تعالیٰ محدثین کی شرط قرارداد کے مطابق چہارم حصّہ صدی تک میری زندگی پہنچ گئی مگر آپ کے نزدیک یہ حدیث بھی غلط۔ اور لکھا تھا کہ مسیح موعود کے وقت میں طاعون پڑے گی اور سخت پڑے گی مگر آپ کے نزدیک یہ حدیث بھی غلط۔ اور لکھا تھا کہ اُس وقت آفتاب میں ایک نشان ظاہر ہوگا۔ چنانچہ اب تک ظاہر ہے اور دُوربین سے دیکھا جاتا ہے مگر آپ کے نزدیک یہ حدیث بھی غلط۔ اور حدیث میں آیا تھا کہ اُن دنوں ستارہ ذوالسنین طلوع کرے گا چنانچہ مدت ہوئی کہ اُس ستارہ کا طلوع ہو چکا مگر آپ کے نزدیک یہ حدیث بھی غلط۔ اور لکھا تھا کہ وہ مسیح موعود اِسی امت میں سے ہوگا۔ اور دمشق سے مشرق کی طرف وہ مبعوث ہوگا مگر آپ کے نزدیک یہ حدیث بھی غلط۔ اور لکھا تھا کہ مسیح موعود کے وقت میں اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی اور اِس میں یہ بھی اشارہ تھا کہ اُس زمانہ میں مدینہ کی طرف سے مکہ تک ریل کی سواری جاری ہو جائے گی مگر آپ کے نزدیک یہ حدیث بھی غلط۔ پس جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں آپ کے نزدیک غلط ہیں تو میری پیشگوئیوں کو غلط کہنے کے وقت آپ کیوں شرم کرنے لگے۔☆

بلکہ حدیث اور میری پیشگوئیوں کا ذکر تو الگ رہا آپ تو مسلمان کہلا کر قرآن شریف سے ہی مُنہ پھیرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ عیسیٰ فوت ہو گیا ہے اور آپ نے اس کو زندہ قرار دے کر

☆ یہ بھی بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ حج کرنے سے روکے جائیں گے مگر یہ سب حدیثیں آپ کے نزدیک غلط ہیں کیونکہ ان سے میرے دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے۔ منہ

﴿۱۱۷﴾ آسمان کے کسی حجرہ میں بٹھا رکھا ہے کیا خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نہیں فرمایا فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔[1] کیا اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ مجھے وفات دینے کے بعد تو ہی اُن پر رقیب تھا۔ اور کیا ان تمام آیات پر نظر ڈالنے سے صریح طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ خدا تعالیٰ کے سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ مَیں جب تک اپنی اُمت میں تھا مَیں اُن کے اعمال کا گواہ تھا اور اُن کے حالات کا علم رکھتا تھا پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو بعد اس کے تو ہی اُن کا رقیب اور محافظ تھا۔ پس کیا اِن آیات کا بدیہی طور پر یہ خاص مطلب نہیں ہے کہ میری اُمت میری زندگی میں نہیں بگڑی بلکہ میری وفات کے بعد بگڑی۔ اور بعد وفات مجھے معلوم نہیں کہ ان کا کیا حال ہوا اور کیا مذہب اختیار کیا۔ پس خدا تعالیٰ کے اس کلام سے ظاہر ہے کہ اگر فرض کیا جائے کہ حضرت عیسیٰ اب تک زندہ ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ عیسائی بھی اب تک بگڑے نہیں اور سچے مذہب پر قائم ہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ اپنی اُمت کا صراط مستقیم پر ہونا اپنی زندگی تک وابستہ کرتے ہیں اور اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ مَیں نے یہ تعلیم دی ہے کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کر کے مانا کرو اور جناب الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ جب تک مَیں اپنی امت میں تھا مَیں نے وہی تعلیم اُن کو دی جس کی تو نے مجھے ہدایت دی تھی اور جب تو نے مجھے وفات دے دی تو بعد کے حالات کا مجھے کچھ علم نہیں۔ اور ان آیات سے صاف طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے ورنہ لازم آتا ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جھوٹ بولیں گے کیونکہ اگر وہ قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ آئے ہوتے تو اِس صورت میں اُن کا یہ کہنا کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میری اُمت نے میرے بعد کیا عقیدہ اختیار کیا صریح جھوٹ ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ جو شخص دوبارہ دنیا میں آوے اور بچشمِ خود دیکھ جاوے کہ اس کی اُمت بگڑ چکی ہے اور نہ صرف ایک دن بلکہ برابر چالیس[۴۰] برس تک اُن کے کفر کی حالت دیکھتا رہے وہ کیونکر قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے کہہ سکتا ہے کہ اپنی امت کی حالت سے محض بے خبر ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ آپ کا یہ عقیدہ کہ

[1] المآئدۃ: ۱۱۸

حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور پھر دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے۔ صاف اور صریح طور پر نصوصِ صریحہ قرآن شریف کے برخلاف ہے مگر پھر بھی آپ اس عقیدہ کو نہیں چھوڑتے پس اس صورت میں ﴿۱۱۸﴾ آپ پر کیا افسوس کروں کہ آپ میرے صدہا نشانوں کو دیکھ کر اُن سے منکر ہوئے جاتے ہیں اور جس طرح ایک شخص کو مٹی کھانے کی عادت ہو جاتی ہے وہ باوجود پیش کئے جانے عُمدہ غذاؤں کے پھر بھی مٹی کھانے کی طرف ہی رغبت کرتا ہے۔ یہی حال آپ کا ہو رہا ہے۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ حدیثوں کی رو سے ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ سمجھتے ہیں۔ صحیح بخاری جس کو آپ اصحّ الکتب بعد کتاب اللّٰہ قرار دیتے ہیں اس میں تو صاف لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن مُردہ روحوں میں دیکھا جو اِس جہان سے گذر چکی ہیں بلکہ حضرت یحییٰ کے پاس جو فوت ہو چکے ہیں اُن کا مقام پایا۔ اب بندۂ خدا کچھ تو خدا تعالیٰ کا خوف کرنا چاہیے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر قبض روح کے یونہی جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چلے گئے تھے تو اُن کو روحوں سے کیا تعلق تھا جو موت کے بعد دوسرے جہان میں پہنچ چکی ہیں اُن کے لئے تو کوئی علیحدہ مکان یا کمرہ چاہیے تھا جس میں جسمانی زندگی بسر کرتے نہ کہ عالم فانی کے رہنے والوں کے پاس چلے جاتے جو موت کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ پس یہ کس قدر جھوٹ ہے جو آپ کے گلے کا ہار ہو رہا ہے جو ایسے شخص کو آپ زندہ قرار دیتے ہیں جو اُنیس سَو برس سے فوت ہو چکا ہے۔ جب تک خدا تعالیٰ نے اس بھید کو نہیں کھولا تھا تب تک تو ہر ایک معذور تھا۔ اب جب کہ حَکَم آ گیا اور حقیقت کھل گئی اور قرآن شریف کی رو سے حضرت عیسیٰ کی موت ثابت ہو گئی اور حدیثوں کی رو سے مردہ روحوں میں اُن کی بود و باش پر گواہی مل گئی اور خدا کے قول سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے یعنی رؤیت سے حضرت عیسیٰ کا وفات پانا بپایۂ ثبوت پہنچ گیا بلکہ مسلم اور صحیح بخاری کی حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ آنے والا مسیح اِسی امت میں سے ہو گا اور اس مسیح نے بھی بحیثیت حَکَم ہونے کے قرآن شریف اور ان احادیث

کے مطابق گواہی دی تو اب بھی نہ ماننا۔ بتلاؤ یہ ایمانداری ہے یا بے ایمانی۔ پھر ایسے آدمی پر افسوس کیا کریں کہ وہ ہمارے نشانوں کو نہیں مانتا جب کہ اس نے نہ خدا کے قول کو مانا اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کو قبول کیا اور نہ چاہا کہ خدا تعالیٰ سے خوف کر کے اپنی غلطی کو ﴿۱۱۹﴾ چھوڑ دے۔ تو ایسا آدمی اگر میرے پر افترا کرے تو مجھے کیوں افسوس کرنا چاہیے۔ ایک کی غلطی دوسرے کے لئے سند نہیں ہوسکتی۔ اگر فیج اعوج کے زمانہ میں ایسا خیال دلوں میں ہو گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں تو وہ قابلِ سند نہیں ہے۔ خیر القرون کے زمانہ میں اس خیال کا نام ونشان نہ تھا ورنہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس بات پر کیوں راضی ہو جاتے کہ سب انبیاء علیہم السلام فوت ہو چکے ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلا اجماع یہی تھا کہ تمام نبی فوت ہو گئے ہیں کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو بعض صحابہ کا یہ بھی خیال تھا کہ آپ فوت نہیں ہوئے اور پھر دنیا میں واپس آئیں گے اور منافقوں کی ناک اور کان کاٹیں گے۔ تو اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور یہ آیت پڑھی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔[1] یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک نبی ہیں اور تمام انبیاء گذشتہ پہلے ان سے فوت ہو چکے ہیں۔ تب صحابہ جو سب کے سب موجود تھے رضی اللہ عنہم سمجھ گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے شک فوت ہو گئے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ **کوئی نبی بھی زندہ نہیں**۔ اور کسی نے **اعتراض نہ کیا** کہ حضرت عیسیٰ اس آیت کے مفہوم سے باہر ہیں اور وہ اب تک زندہ ہیں۔ اور کیا ممکن تھا کہ عاشقانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر راضی ہو سکتے کہ ان کا نبی تو چھوٹی سی عمر میں فوت ہو گیا اور عیسیٰ چھ سَو برس سے زندہ چلا آتا ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا بلکہ وہ تو اس خیال سے زندہ ہی مر جاتے پس اسی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سب کے سامنے یہ آیت پڑھ کر ان کو تسلی دی مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ [2] اور اس آیت نے ایسا

[1] [2] آل عمران: ۱۴۵

اثر صحابہ کے دل پر کیا کہ وہ مدینہ کے بازاروں میں یہ آیت پڑھتے پھرتے تھے گویا اُسی دن وہ نازل ہوئی تھی۔ اور **اسلام میں یہ اجماع تمام اجماعوں سے پہلا تھا کہ تمام نبی فوت ہو چکے ہیں**۔ مگر اے مولوی صاحب!! آپ کو صحابہ کے اس اجماع سے کیا غرض۔ آپ کا مذہب تو تعصب ہے نہ کہ اسلام۔

﴿۱۲۰﴾ مذہب اسلام ایسے **باطل عقیدوں** سے دن بدن تباہ ہوتا جاتا ہے مگر آپ لوگ خوش ہیں۔

رونق دیں عقائدت بُردہ دشمناں شاد و یار آزردہ

معلوم ہوتا ہے کہ اس اجماع سے پہلے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی وفات پر ہوا بعض نادان صحابی جن کو درایت سے کچھ حصہ نہ تھا وہ ابھی اس عقیدہ سے بے خبر تھے کہ کل انبیاء فوت ہو چکے ہیں اور اسی وجہ سے صدیق رضی اللہ عنہ کو اس آیت کے سنانے کی ضرورت پڑی اور اس آیت کے سننے کے بعد سب نے یقین کر لیا کہ تمام گذشتہ لوگ داخلِ قبور ہو چکے ہیں اِسی وجہ سے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ چند **شعر** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرثیہ میں بنائے جس میں اُس نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہیں۔

کنت السّواد لناظری فعمی علیک الناظر

من شاء بعدک فلیمت فعلیک کنت احاذر

(ترجمہ) تو میری آنکھوں کی پتلی تھا پس مَیں تو تیرے مرنے سے اندھا ہو گیا۔ اب بعد تیرے جو شخص چاہے مرے (عیسیٰ ہو یا موسیٰ ہو) مجھے تو تیرے ہی مرنے کا خوف تھا۔

جزاہ اللّٰہ خیر الجزاء محبت اِسی کا نام ہے۔☆

☆ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اس امت پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا شکر نہیں ہو سکتا اگر وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو مسجد نبوی میں اکٹھے کر کے یہ آیت نہ سناتے کہ تمام گزشتہ نبی فوت ہو چکے ہیں تو یہ امت ہلاک ہو جاتی۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس زمانے کے مفسد علماء یہی کہتے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی مذہب تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں۔ مگر اب صدیق اکبر کی آیت ممدوحہ پیش کرنے سے اس بات پر کل صحابہ کا اجماع ہو چکا کہ کل گزشتہ نبی فوت ہو چکے ہیں بلکہ

اور اگر ایک ذرّہ انصاف ہو تو معلوم ہوگا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام اس عقیدہ کے مخالف تھے کہ کوئی آسمان پر جا کر پھر دنیا میں آتا ہے اِسی لئے جب اُن سے الیاس نبی کے دوبارہ آنے کے بارہ میں یہودیوں نے پوچھا اور کتابیں دکھلائیں کہ لکھا ہے کہ الیاس دوبارہ دنیا میں آئے گا تب بعد الیاس آنے کے وہ مسیح موعود آئے گا جس کے آنے کا یہود کو وعدہ دیا گیا تھا اور بتلایا گیا تھا کہ وہ ان کا خاتم الانبیاء ہوگا تو عیسیٰ علیہ السلام نے یہ اعتراض سن کر فرمایا کہ یوحنا نبی جو تم میں موجود ہے اور مجھ سے پہلے آچکا ہے یہی الیاس ہے جس نے قبول کرنا ہو قبول کرے۔ اور یہ قول آپ کا یہود کو بہت ہی بُرا معلوم ہوا۔ اور اُن کو کافر اور بدعتی اور اجماع اُمت کے برخلاف ایک بات کہنے والا قرار دیا۔ چنانچہ ایک کتاب جو حال میں ایک بڑے یہودی فاضل نے تالیف کی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اُس میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کے لئے بڑا شور ڈالتا ہے اور اُن کو وہ نعوذ باللہ کذاب اور کافر اور ملحد کہتا ہے اور لوگوں کے سامنے اس بات کا اپیل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم خود منصف ہو کر سوچو کہ جس حالت میں خدا نے اپنی کتاب میں یہ خبر دی تھی جیسا کہ صحیفہ ملاکی میں لکھا ہے۔ جس کی صحت اور منجانب اللہ ہونے کا ﴿۱۲۱﴾

تتمہ حاشیہ

اُس اجماع پر شعر بنائے گئے۔ ابوبکر کی روح پر خدا تعالیٰ ہزاروں رحمتوں کی بارش کرے اُس نے تمام روحوں کو ہلاکت سے بچالیا اور اس اِجماع میں تمام صحابہ شریک تھے۔ ایک فرد بھی ان میں سے باہر نہ تھا۔ اور یہ صحابہ کا پہلا اجماع تھا اور نہایت قابل شکر کارروائی تھی۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مسیح موعود کی باہم ایک مشابہت ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ قرآن شریف میں دونوں کی نسبت یہ تھا کہ جب ایک خوف کی حالت اسلام پر طاری ہوگی اور سلسلہ مرتد ہونے کا شروع ہوگا تب ان کا ظہور ہوگا سو حضرت ابوبکر اور مسیح موعود کے وقت میں ایسا ہی ہوا۔ یعنی حضرت ابوبکر کے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدہا جاہل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ اور صرف دو مسجدیں باقی تھیں جن میں نماز پڑھی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر نے دوبارہ ان کو اسلام پر قائم کیا ایسا ہی مسیح موعود کے وقت میں کئی لاکھ انسان اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی بن گئے اور یہ دونوں حالات قرآن شریف میں مذکور ہیں یعنی پیشگوئی کے طور پر ان کا ذکر ہے۔ منہ

اس شخص کو اقرار ہے کہ یہودیوں کا مسیح موعود نہیں آئے گا جب تک کہ الیاس نبی دوبارہ دنیا میں آسمان سے نازل ہو کر نہ آوے۔ اور معلوم ہے کہ اب تک الیاس نبی آسمان سے نازل نہیں ہوا جس کا نازل ہونا مسیح موعود سے پہلے ضروری ہے تو ہم کیونکر اس کو سچا مسیح موعود سمجھ لیں۔ کیا ہم اپنے ایمان کو ضائع کر دیں یا توریت سے روگردان ہو جائیں کیا کریں۔ اور جب کہ کھلے کھلے لفظوں میں ملاکی نبی نے خدا تعالیٰ سے وحی پا کر ہمیں خبر دی ہے کہ ضرور ہے کہ مسیح موعود یہودیوں میں پیدا نہ ہو جب تک کہ خدا کے وعدہ کے موافق الیاس نبی دوبارہ دنیا میں نہ آوے تو پھر یہ شخص یہودیوں کا مسیح موعود کیونکر ہو سکتا ہے☆ اور جب کہ ایسی

یہودیوں کا یہ مذہب ہے کہ مسیح دو ہیں (۱) ایک وہ مسیح جو پہلے آنے والا ہے جس کے لئے یہ شرط ہے کہ اس سے پہلے الیاس دوبارہ دنیا میں آئے گا۔ یہی مسیح تھا جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے دعویٰ کیا کہ وہ میں ہوں مگر یہودی فاضلوں نے اس دعوے کو قبول نہ کیا اور کہا کہ یہ دعویٰ نصوصِ صریحہ کتاب اللہ کے مخالف ہے۔ وجہ یہ کہ جیسا کہ خدا کی کتاب بتلاتی ہے الیاس دوبارہ آسمان سے زمین پر نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰ نے بار بار کہا کہ ایسی عبارتیں استعارہ کے رنگ میں ہوتی ہیں اور الیاس سے مراد اس جگہ یحییٰ یعنی یوحنا نبی ہے مگر چونکہ یہودی سخت ظاہر پرست تھے انہوں نے اس تاویل کو قبول نہ کیا اور اب تک اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ کو قبول نہیں کرتے اور بہت توہین کرتے ہیں (۲) دوسرا مسیح جس کی یہودیوں کو انتظار ہے وہ ہے جس کی نسبت ان کا عقیدہ ہے کہ وہ چھٹے ہزار کے اخیر میں آئے گا اس لئے آج کل نہایت اضطراب یہودیوں میں ہے کیونکہ قمری حساب کی رو سے چھٹا ہزار آدم سے ختم ہو گیا اور اب ساتواں ہزار چل رہا ہے مگر وہ مسیح موعود اب تک نہیں آیا۔ عیسائیوں کے محققین کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ آمد ثانی ان کے مسیح کی چھٹے ہزار کے آخر میں ہوگی۔ اب وہ بھی نومیدی میں پڑ گئے کیونکہ چھٹے ہزار کا خاتمہ ہو گیا آخر انہوں نے نومید ہو کر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کلیسیا کو ہی مسیح سمجھ لو اور آنے والے سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ غرض یہودیوں کے نزدیک مسیح دو ہیں اور آخری مسیح موعود جو چھٹے ہزار کے آخر میں آنے والا تھا وہ ان کے نزدیک پہلے مسیح سے بہت افضل اور صاحب اقبال ہے مگر وہ تو دونوں مسیحوں سے محروم رہے نہ وہ ملا نہ وہ ملا۔ منہ

تصریح اور وضاحت سے الیاس نبی کے دوبارہ آنے کی قبل از مسیح موعود ہمیں خبر ملی ہے جس کی کوئی تاویل نہیں ہوسکتی تو پھر اگر ہم تکلف سے صَرف عَنِ الظَّاھر کر کے اس پیشگوئی کی کچھ تاویل کر دیں تو یہ سخت بے ایمانی ہوگی۔ ہمیں خدا نے اپنی کتاب میں یہ تو نہیں بتلایا کہ مسیح موعود سے پہلے الیاس نبی کا کوئی مثیل آئے گا بلکہ اُس نے تو صاف طور پر ہمیں خبر دے دی ہے کہ خود الیاس ہی دوبارہ آسمان سے نازل ہو جائے گا تو پھر ایسی صریح خبر سے ہم کیونکر انکار کر دیں اور پھر آخر مضمون میں لکھتا ہے کہ اگر خدا نے قیامت کے دن ہم سے پوچھا کہ تم نے اس شخص یعنی یسوع بن مریم کو کیوں قبول نہ کیا اور کیوں اُس پر ایمان نہ لائے تو ہم ملاکی نبی کی کتاب اُس کے سامنے پیش کر دیں گے۔ ﴿۱۲۲﴾

غرض یہ عقیدہ قدیم سے یہود کا ہے کہ اُن کا سچا مسیح موعود جو پہلا مسیح موعود ہے تبھی آئے گا جب پہلے اس سے الیاس نبی دوبارہ دنیا میں آجائے گا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن کی ایک نہ سُنی اور ان کو یہی سُنائی کہ اس آنے والے سے مراد یوحنا نبی ہے۔ یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فیصلہ ہے جس کے برخلاف آپ لوگوں نے شور مچا رکھا ہے۔ کیا الیاس نبی دوبارہ دنیا میں آ گیا تا حضرت عیسیٰ بھی دوبارہ آجائیں گے بلکہ اگر کسی شخص کا دوبارہ دنیا میں آنا جائز ہے تو اس سے حضرت عیسیٰ سچے نبی ٹھہر نہیں سکتے اور ان کی نبوت باطل ہوتی ہے کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے ناحق اپنی بات بنانے کے لئے یحییٰ نبی کو الیاس بنا دیا ورنہ الیاس ابھی آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ کیا عقلمند کے لئے الیاس نبی کے دوبارہ آنے کا قصہ جس کی وجہ سے کئی لاکھ یہودی حضرت عیسیٰ کو ردّ کر کے واصل جہنم ہو گئے عبرت کا مقام نہیں؟

جب کہ الیاس نبی جس کا آسمان سے نازل ہونا حضرت عیسیٰ کے دعویٰ کی سچائی کے لئے ایک علامت مقرر کی گئی تھی آسمان سے نازل نہ ہوا تو اب وہی راہ اس زمانہ کے مسلمان کیوں اختیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے پہلے اِس سے یہودی کافر ہو گئے۔ اگر آسمان سے نازل ہونا سنت اللہ میں داخل ہوتا تو الیاس کی راہ میں کون سے پتھر پڑ گئے تھے کہ باوجودیکہ خدا تعالیٰ

کی کتاب میں اس کے نازل ہونے کا وعدہ تھا پھر بھی نازل نہ ہو سکا اور حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کے مقابل پر شرمندگی اٹھانی پڑی اور آخر یحییٰ نبی کو الیاس نبی کا مثیل ٹھہرا کر یہودیوں کے بکواس سے پیچھا چھڑایا۔

خیال کرنا چاہیے کہ کس قدر عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کی اس حجت بازی سے دُکھ پہنچتا ہوگا جب کہ وہ بار بار کہتے تھے کہ تو کس طرح سچا مسیح موعود ہوسکتا ہے جب کہ تجھ میں مسیح موعود کے علامات نہیں پائے جاتے کیونکہ خدا کی کتاب صاف لفظوں میں کہتی ہے کہ مسیح موعود نہیں آئے گا جب تک پہلے اس سے الیاس نبی دوبارہ دنیا میں نہ آ جائے۔ اِس حجت میں بظاہر ﴿۱۲۳﴾ یہودی سچے تھے کیونکہ الیاس آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا اور نہ اب تک آسمان سے نازل ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر یہودیوں نے شرارتوں اور گستاخیوں میں دلیری کی اس کی یہی وجہ تھی کہ ظاہر الفاظ کتاب اللہ کے لحاظ سے جو مسیح موعود کی علامت تھی وہ علامت حضرت مسیح میں پائی نہ گئی اور حضرت مسیح اپنے دل میں سمجھ چکے تھے کہ میرا جواب صرف تاویلی ہے جس کو یہود قبول نہیں کریں گے اس لئے انہوں نے نرم لفظوں میں کہا کہ جو الیاس دوبارہ دنیا میں آنا تھا وہ یہی یحییٰ بن زکریا ہے چاہو تو قبول کرو۔ ایسا ہی آسمان پر چڑھنے اور اُترنے کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگا گیا تھا جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے۔ آخر اُن کو صاف جواب دیا گیا اور خدا تعالیٰ نے فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا[1] اور عیسائیوں کو یہودی اب تک تنگ کیا کرتے ہیں کہ اگر عیسیٰ حقیقت میں مسیح موعود تھا تو کیوں الیاس نبی پہلے اس سے نازل نہ ہوا۔ عیسائی ہمیشہ اس اعتراض سے لاجواب رہتے ہیں اور ان کے سامنے بات نہیں کر سکتے۔

سو ہمارے مخالفوں کو الیاس نبی کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی سے سبق حاصل کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ یہودیوں کی طرح ان کا انجام ہو مگر مماثلت پوری کرنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ جیسا کہ اُن سے پہلے یہودیوں نے حضرت الیاس کے دوبارہ آنے کے بارہ میں حضرت عیسیٰ

[1] بنی اسرائیل:۹۴

سے بہت جھگڑا کیا تھا اور اُن کو بے دین اور کافر اور ملحد ٹھہرایا تھا اِسی طرح حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے میں ان لوگوں کا مجھ سے بھی جھگڑا ہوتا۔ یہ نادان سمجھتے نہیں کہ جس شخص کے دوبارہ آنے کے لئے روتے اور مجھے گالیاں نکالتے ہیں وہی میرے دعویٰ کی اُن پر ڈگری کرتا ہے کیونکہ بعینہٖ اس بیان کے مطابق جو حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کے بارہ میں مَیں ان لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہی بیان حضرت عیسیٰ کا یہودیوں کے سامنے تھا۔ اور جس طرح خدا نے میرا نام عیسیٰ رکھا ہے اِسی طرح خدا نے یحییٰ نبی کا نام الیاس رکھ دیا تھا۔ اور یہی نظیر جو مذکور ہو چکی ہے ایک ایماندار کے لئے تسلی بخش ہے۔ اور خدا بھی تو فرماتا ہے۔ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[1] اور یہودی تو ایک درجہ تک معذور بھی تھے کیونکہ یہودیوں کے زمانہ میں ابھی کسی انسان کے دوبارہ آنے میں خدا تعالیٰ کی کتابوں میں فیصلہ نہیں ہوا تھا مگر اب تو فیصلہ ہو چکا کیا الیاس نبی ملاکی نبی کی پیشگوئی کے مطابق دوبارہ دنیا میں آ گیا تا یہ لوگ بھی حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے کی امید رکھیں۔ اور صحیح حدیثوں میں تو دوبارہ آنے کا کوئی لفظ بھی نہیں صرف نزول کا لفظ ہے جو محض اجلال اور اکرام کے لئے آتا ہے۔ ہر ایک عزیز مہمان کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ تشریف لائیں گے تو ہمارے ہاں اُتریں گے تو کیا اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ آسمان سے واپس آئیں گے۔ واپس آنے کے لئے عربی زبان میں رجوع کا لفظ ہے نہ نزول کا۔ بڑا افسوس ہے کہ ناحق یہ عقیدہ جو عیسائی مذہب کو مدد دیتا ہے مسلمان کہلانے والوں کے گلے کا ہار ہو گیا۔

﴿۱۲۴﴾

ہمارے مخالف سخت شرمندہ اور لاجواب ہو کر آخر کو یہ عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہمارے بزرگ ایسا ہی کہتے چلے آئے ہیں۔ نہیں سوچتے کہ وہ بزرگ معصوم نہ تھے بلکہ جیسا کہ یہودیوں کے بزرگوں نے پیشگوئیوں کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ان بزرگوں نے بھی ٹھوکر کھالی اور خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت سے ایسا ہی ایک غلط عقیدہ اُن میں شائع ہو گیا جیسا کہ یہود میں یہ عقیدہ شائع ہو گیا تھا کہ الیاس نبی دوبارہ آسمان سے نازل ہوگا اور یہود کے بزرگ بڑی محبت اور شوق سے الیاس نبی کے دوبارہ آنے کے منتظر تھے اُن کی نظموں اور نثروں میں بڑے درد اور

[1] الانبیاء:۸

وجد سے انتظار کی اُمیدیں پائی جاتی ہیں اور تمہارے بزرگ تو معصوم نہ تھے مگر اُن میں باوجود اس کے کہ اُن میں نبی اور خدا سے وحی پانے والے بھی تھے سب غلطی میں مبتلا رہے اور یہ عقدہ سربستہ رہا کہ الیاس نبی کے دوبارہ آنے سے کوئی اور نبی مراد ہے۔ نہ یہ کہ درحقیقت الیاس ہی نازل ہوگا۔ اور اس وقت تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے کسی نبی یا ولی کو یہ راز سربستہ سمجھ نہ آیا کہ الیاس کے دوبارہ آنے سے مراد یحییٰ نبی ہے نہ کہ درحقیقت الیاس۔ پس یہ کوئی نئی بات نہیں کہ اس اُمت کے بعض بزرگ کسی ایک بات کے سمجھنے میں دھوکہ کھاویں۔ اور عجیب تر یہ کہ اس مسئلہ میں بھی ان بزرگوں کا اتفاق نہیں۔ بہت سے ایسے علماء گذرے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے قائل ہیں۔ ان میں سے حضرت مالک رضی اللہ عنہ بھی ہیں جیسا کہ لکھتے ہیں۔ **قد اختلف فی عیسٰی علیه السلام هل هو حیّ او میّت و قال مالک مات** یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا اور مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ مرگیا ہے۔ اور محی الدین ابن العربی صاحب اپنی ایک کتاب میں جو ان کی آخری کتاب ہے لکھتے ہیں کہ عیسیٰ تو آئے گا مگر بروزی طور پر یعنی کوئی اور شخص اس امت کا عیسیٰ کی صفت پر آجائے گا صوفیوں کا یہ مقررشدہ مسئلہ ہے کہ بعض کاملین اس طرح پر دوبارہ دنیا میں آجاتے ہیں کہ اُن کی روحانیت کسی اور پر تجلی کرتی ہے اور اس وجہ سے وہ دوسرا شخص گویا پہلا شخص ہی ہوجاتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی ایسا ہی اصول ہے اور ایسے آدمی کا نام وہ **اوتار** رکھتے ہیں۔ ﴿۱۲۵﴾

اور یہ خیال کہ کوئی زندہ آدمی آسمان پر چلا گیا اور یا گُم ہوگیا یہ بھی ایک پُرانا خیال پایا جاتا ہے جس کے پہلے وقتوں میں کچھ اور معنے تھے اور پھر جاہلوں نے سمجھ لیا کہ درحقیقت کوئی شخص مع جسم آسمان پر چلا جاتا ہے اور پھر آتا ہے۔ سیّد احمد صاحب بریلوی کی نسبت بھی کچھ ایسے ہی خیالات اُن کے گروہ کے لوگوں میں آج تک شائع ہیں۔ گویا وہ بھی حضرت عیسیٰ کی طرح پھر آئیں گے۔ اور اگرچہ وہ پہلی آمد میں حضرت عیسیٰ کی طرح ناکام رہے مگر دوسری مرتبہ خوب تلوار چلائیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ بڑے بڑے دعوے کرکے پھر ناکام اور نامراد دنیا سے چلے گئے اُن کی پردہ پوشی کے لئے یہ باتیں بنائی گئیں۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کوئی اعتقاد نہیں رکھتا کہ آپ بھی پھر آئیں گے کیونکہ آنجناب نے اپنی آمد اوّل میں ہی کافروں کو وہ ہاتھ دکھائے جواب تک یاد کرتے ہیں اور پوری کامیابی کے ساتھ آپ کا انتقال ہوا۔

اور معلوم ہوتا ہے کہ ابن العربی صاحب نے آخر عمر میں اپنے پہلے اقوال سے رجوع کر لیا تھا۔ اس لئے ان کا آخری بیان پہلے بیان سے متناقض ہے۔ ایسا ہی بعض اور فرقے صوفیوں کے کھلے طور پر حضرت عیسیٰ کی وفات کے قائل ہیں۔ اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کا اسی پر اجماع ہو گیا تھا جو انبیاء گذشتہ جن میں حضرت عیسیٰ بھی شامل ہیں فوت ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے ایک بھی زندہ نہیں پھر جیسے جیسے مذہب اسلام میں جہالت اور بدعات پھیلتی گئیں یہ بدعت بھی دین کا ایک جزو ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ مُردہ ارواح کی جماعت میں سے نکل کر پھر دنیا میں واپس آئیں گے۔ اِس عقیدہ نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے کیونکہ تمام دنیا میں سے صرف ایک ہی انسان کو یہ خصوصیت دی ہے کہ وہ آسمان پر مع جسم چلا گیا اور کسی زمانہ میں مع جسم واپس آئے گا۔ یہ عقیدہ حضرت عیسیٰ کو خدا بنانے کی پہلی اینٹ ہے کیونکہ ان کو ایک خصوصیت دی گئی ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ خدا جلد یہ داغ اسلام کے چہرہ سے دور کرے۔ آمین ﴿۱۲۶﴾

بالآخر میں مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب کو محض حسبةً لِلّٰہ نصیحت کرتا ہوں کہ آپ آخر عمر تک پہنچ گئے ہیں۔ اب خدا تعالیٰ کے مقابل پر بیہودہ چالاکیوں کو چھوڑ دیں۔ آپ نے بہت زور لگایا ہر ایک قسم کا مکر کیا اور نور کے بجھانے کے لئے قابل شرم منصوبوں سے کام لیا مگر انجام کار نامراد رہے۔ اگر میں مفتری ہوتا تو آپ کا کہیں نہ کہیں ہاتھ پڑ جاتا اور میں کب کا تباہ ہو جاتا۔ ایسا آدمی جو ہر روز خدا پر جھوٹ بولتا ہے اور آپ ہی ایک بات تراشتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ خدا کی وحی ہے جو مجھ کو ہوئی ہے۔ ایسا بدذات انسان تو کتوں اور سؤروں اور بندروں سے بدتر ہوتا ہے پھر کب ممکن ہے کہ خدا اس کی حمایت کرے۔ اگر یہ کاروبار

انسان کا ہوتا اور خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو اس کا نام ونشان نہ رہتا۔ پچیس[۲۵] برس بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت گذر گئی جب میں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوں اور اگرچہ اس دعوے پر ایک دنیا کو مخالفت کا جوش رہا مگر اے مولوی صاحب آپ نے تو میری ایذاء میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھا اور آپ نہ صرف پبلک کو بلکہ ہمیشہ گورنمنٹ انگریزی کو بھی دھوکا دیتے رہے کہ یہ شخص مفتری اور گورنمنٹ کا بدخواہ ہے اور خون جیسے سنگین مقدمے میرے پر کئے گئے اور آپ ایسے مقدمات کے ثابت کرانے کے لئے خود گواہ بن کر کچہری میں حاضر ہوئے۔ اور میرے پر کفر کے فتوے لکھائے اور مجھ سے لوگوں کو بیزار کرنا چاہا۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب کہ میرے ساتھ صرف چند آدمی تھے اور ﴿۱۲۷﴾ آپ کی مخالفانہ کوششوں کے بعد کئی لاکھ آدمی میرے ساتھ ہو گئے۔ اگر میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو میرے تباہ کرنے کے لئے آپ کی کوششوں کی ضرورت نہ تھی۔ میں خود اپنے افترا اور شامتِ اعمال سے تباہ ہو جاتا۔ یہ بات عقلِ سلیم قبول نہیں کر سکتی کہ ایک مفتری کو ایک ایسی لمبی مہلت دی جائے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت سے بھی زیادہ ہو کیونکہ اِس طرح پر امان اُٹھ جاتا ہے اور کوئی مابہ الامتیاز صادق اور کاذب میں قائم نہیں رہتا۔ بھلا اس بات کا تو جواب دو کہ جب سے میں نے دعویٰ کیا ہے کس قدر مقدمے میرے خلاف فوجداری میں اٹھائے گئے اور کوشش کی گئی کہ مجھے ماخوذ کرائیں اور آپ نے ایسے مقدمات کی تائید میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر کیا کسی مقدمہ میں آپ یا آپ کا گروہ فتح یاب بھی ہوا؟ اگر مَیں صادق نہ ہوتا تو کیا وجہ کہ ہر ایک جگہ اور ہر ایک موقعہ میں خدا تعالیٰ کاذب کی ہی حمایت کرتا رہا اور جو صادق کہلاتے تھے ہر ایک میدان میں اُن کا منہ کالا ہوتا رہا۔ بددعائیں کرتے کرتے سجدوں میں اُن کی ناک گھس گئی مگر دن بدن خدا میری مدد کرتا رہا اور میرے مقابل پر ان کی کوئی دعا قبول نہ ہوئی اور آپ کا تو اب تک شیوہ رہا ہے کہ بار بار خلاف واقعہ باتیں میری نسبت اپنے رسالوں اور نیز اخباروں

میں درج کرا کر گورنمنٹ انگریزی کو اُکساتے اور میرے پر بدظن کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی شرارتوں سے کیا ہوسکتا ہے۔ آپ یاد رکھیں کہ ان شرارتوں میں آپ ہمیشہ نامراد رہیں گے۔ کوئی امر زمین پر نہیں ہوسکتا جب تک آسمان پر قرار نہ پاوے۔

اور اس **گورنمنٹ محسن** کی نسبت میرے دل میں کوئی بد اِرادہ نہیں ہے۔ میں جوان تھا اور اب بوڑھا ہوگیا۔ قدیم سے میں نے اپنی بہت سی کتابوں میں بار بار یہی شائع کیا ہے کہ اس **گورنمنٹ کے ہمارے سر پر احسان ہیں کہ اس کے زیر سایہ ہم آزادی سے اپنی خدمت تبلیغ پوری** کرتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ظاہری اسباب کی رُو سے آپ کے رہنے کے لئے اور بھی ملک ہیں اور اگر آپ اس ملک کو چھوڑ کر مکہ میں یا مدینہ میں یا قسطنطنیہ میں چلے جائیں تو سب ممالک آپ کے مذہب اور مشرب کے موافق ہیں۔ لیکن اگر مَیں جاؤں تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ سب لوگ میرے لئے بطور درندوں کے ہیں **اِلّا ما شاء اللّٰہ**۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا میرے پر احسان ہے کہ ایسی گورنمنٹ کے زیر سایہ مجھے مبعوث فرمایا ہے جس کا مسلک دلآزاری نہیں اور اپنی رعایا کو امن دیتی ہے مگر باوجود اس کے میں صرف ایک ہی ذات پر توکل رکھتا ہوں اور اُسی کے پوشیدہ تصرفات میں سے جانتا ہوں کہ اُس نے اِس گورنمنٹ کو میری نسبت مہربان بنا رکھا ہے اور کسی شریر مخبر کی پیش چلنے نہیں دی اور مَیں امید رکھتا ہوں کہ قبل اس کے جو مَیں اس دنیا سے گذر جاؤں۔ مَیں اپنے اُس حقیقی آقا کے سوا دوسرے کا محتاج نہیں ہوں گا اور وہ ہر ایک دشمن سے مجھے اپنی پناہ میں رکھے گا۔ **فَالحمد للّٰہ اوّلًا و اٰخرًا و ظاھرًا و باطنًا ھو ولیّ فی الدّنیا والاٰخرۃ وھو نعم المولٰی و نعم النّصیر** ۔ اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ وہ میری مدد کرے گا اور وہ مجھے ہرگز ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ اگر تمام دنیا میری مخالفت میں درندوں سے بدتر ہو جائے تب بھی وہ میری حمایت کرے گا۔ مَیں نامرادی کے ساتھ ہرگز قبر میں نہیں اُتروں گا کیونکہ میرا خدا میرے ہر قدم میں میرے ساتھ ہے اور مَیں اس کے ساتھ ہوں۔ میرے اندرون کا جو اُس کو علم ہے کسی کو بھی علم

﴿۱۲۸﴾

نہیں۔ اگر سب لوگ مجھے چھوڑ دیں تو خدا ایک اور قوم پیدا کرے گا جو میرے رفیق ہوں گے۔ نادان مخالف خیال کرتا ہے کہ میرے مکروں اور منصوبوں سے یہ بات بگڑ جائے گی اور سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا مگر یہ نادان نہیں جانتا کہ جو آسمان پر قرار پا چکا ہے زمین کی طاقت میں نہیں کہ اس کو محو کر سکے۔ میرے خدا کے آگے زمین و آسمان کانپتے ہیں۔ خدا وہی ہے جو میرے پر اپنی پاک وحی نازل کرتا ہے اور غیب کے اسرار سے مجھے اطلاع دیتا ہے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اور ضروری ہے کہ وہ اس سلسلہ کو چلاوے اور بڑھاوے اور ترقی دے جب تک وہ پاک اور پلید میں فرق کر کے نہ دکھلاوے۔ ہر ایک مخالف کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اِس سلسلہ کے نابود کرنے کے لئے کوشش کرے اور ناخنوں تک زور لگاوے اور پھر دیکھے کہ انجام کار وہ غالب ہوا یا خدا۔ پہلے اس سے ابوجہل اور ابولہب اور ان کے رفیقوں نے حق کے نابود کرنے کے لئے کیا کیا زور لگائے تھے مگر اب وہ کہاں ہیں۔ وہ فرعون جو موسیٰ ﴿۱۲۹﴾ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا اب اس کا کچھ پتہ ہے۔ پس یقیناً سمجھو کہ صادق ضائع نہیں ہو سکتا وہ فرشتوں کی فوج کے اندر پھرتا ہے۔ بدقسمت وہ جو اُس کو شناخت نہ کرے۔

آپ سوچیں کہ آپ کے وہ مجدّد صاحب کہاں گئے جن کو آپ نے مجدّد کا خطاب دیا تھا اگر آسمان میں اُن کا یہ خطاب ہوتا تو وہ اپنے قول کے موافق جس کو انہوں نے حجج الکرامہ میں شائع کیا ہے اِس صدی سے پچیس[۲۵] برس تک زندہ رہتے مگر وہ تو صدی کے سر پر ہی فوت ہو گئے اور جس کو آپ کاذب کہتے ہیں اس نے قریباً صدی کا چہارم حصہ پا لیا ہے۔

مَیں آپ کو محض لِلّٰہ پھر دوبارہ یاد دلاتا ہوں کہ یوں تو ہر ایک نبی کا مخالف یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نبی سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا اور نہ کوئی پیشگوئی اُس کی پوری ہوئی جیسا کہ ہم یہودیوں کی کتابوں میں حضرت عیسیٰ کی نسبت دیکھتے ہیں۔ اور یہی ہم عیسائیوں

خطبات امام

○

خطبہ جمعہ سیدنا امیر المومنین حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

فرمودہ مورخہ 4 ستمبر 2015ء

تقویٰ، توکل علی اللہ اور ذکر الٰہی

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اِيَّا كَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

ایک دنیادار شخص کو جب یہ کہا جائے کہ اگر کسی میں حقیقی تقویٰ پیدا ہو جائے تو اسے دنیا جہان کی سب نعمتیں مل جاتی ہیں تو وہ یقیناً یہ کہے گا کہ یہ سب فضول باتیں ہیں اور مذہب کے نام پر اپنے اردگرد لوگوں کو جمع کرنے کے لئے لوگ یہ باتیں کرتے ہیں۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کہ آجکل مذہب کے نام پر بعض لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں اور ان کے ذاتی مفاد ہوتے ہیں لیکن نہ تو ان میں خود تقویٰ ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے

پیچھے چلنے والوں میں تقویٰ ہوتا ہے۔لیکن اس کے مقابلے پر ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء اور ان کی جماعتیں، حقیقی تعلیم پر چلنے والے یہ لوگ تقویٰ کا ادراک رکھتے ہیں۔اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے کاروباروں میں لگے ہونے کے باوجود تقویٰ کی تلاش کرتے ہیں اور تقویٰ پر چلتے ہیں۔ مجھے سینکڑوں خط آتے ہیں جن میں اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم میں اور ہماری اولادوں میں تقویٰ پیدا کرے۔ یہ تبدیلی یقیناً حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ماننے اور اپنا عہد بیعت نبھانے کے احساس کی وجہ سے ہے۔اس خواہش نے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کی خشیت اور خوف نے انہیں دنیا کی چیزوں سے بے پرواہ تو کیا ہے لیکن دنیا کی نعمتوں سے وہ محروم نہیں رہے۔اللہ تعالیٰ انبیاء کو بھی اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اور ان کے حقیقی ماننے والوں اور تعلیم پر چلنے والوں کو بھی ان دنیاوی نعمتوں سے نوازتا ہے۔بعض دفعہ بعض عارضی تنگیاں ہوتی ہیں لیکن پھر اللہ تعالیٰ کے فضل ہوتے ہیں اور حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔اسی طرح متقی میں قناعت بھی ہوتی ہے اور قناعت کی وجہ سے وہ معمولی تنگیوں کو برداشت بھی کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے جو فضل ہوتے ہیں، جو نعمت ملتی ہے اس پہ اظہار بھی کرتا ہے۔ پھر جو اللہ تعالیٰ اس کو دیتا ہے اس کے تھوڑے پر بھی متقی کو خدا تعالیٰ کے شکر کی عادت پیدا ہوتی ہے اور جب خدا تعالیٰ کے شکر کی عادت پیدا ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ مزید فضل فرماتا ہے اور انہی فضلوں کو دیکھتے ہوئے ایک حقیقی مومن پھر قربانیوں کے لئے تیار بھی رہتا ہے اور کرتا بھی ہے۔آج اس زمانے میں اس مضمون کا حقیقی ادراک ہم احمدیوں کو ہے جن کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بھی ہے اور آپؐ کے غلامِ صادق کا زمانہ اور اسوہ بھی ہے۔

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس بات کو بیان کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے سب کچھ چھین لیا اور اسی طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم سے بھی چھین لیا مگر خدا تعالیٰ کے مقابلے میں انہوں نے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔آخر خدا تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دیا۔اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی خدا تعالیٰ کے لئے سب کچھ چھوڑا

اور باوجود اس کے کہ اپنے خاندان میں (جائیداد کے) نصف حصے کے مالک تھے آپ کی بھاوج جنہیں خدا تعالیٰ نے بعد میں احمدی ہونے کی توفیق دی، سمجھتی تھیں کہ آپ مفت خورے ہیں۔ (اور بڑی تنگیاں ہوتی تھیں) مگر (پھر بھی) خدا تعالیٰ نے آپ کو سب کچھ دیا۔ اس حالت کا نقشہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کھینچا ہے کہ

لُفَاظَاتُ الْمَوَائِدِ کَانَ اُکْلِیْ

وَصِرْتُ الْیَوْمَ مِطْعَامَ الْاَھَالِیْ

کہ ایک زمانہ تھا جب میں دوسروں کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرتا تھا مگر اب خدا نے مجھے یہ توفیق دی ہے کہ ہزاروں لوگ میرے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔''

(ماخوذ از خطبات محمود جلد 11 صفحہ 313-314)

آج ہم احمدیوں کا ایمان یقیناً اس بات سے بڑھتا ہے جب ہم آپ کے ابتدائی زمانے اور بعد کے زمانے کو دیکھتے ہیں۔ اس حالت کا مزید نقشہ کھینچتے ہوئے ایک جگہ حضرت مصلح موعودؓ نے اس طرح بھی بیان فرمایا کہ:

''حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب پیدا ہوئے تو آپ کے ماں باپ نے آپ کی پیدائش پر خوشی کی ہوگی مگر جب آپ کی عمر بڑی ہوگئی اور آپ کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوگئی تو آپ کے والد آپ کی اس حالت کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے کہ ہمارا بیٹا کسی کام کے قابل نہیں۔ حضرت مصلح موعود نے ایک واقعہ سنایا۔ اس کا پہلے بھی میں ذکر کر چکا ہوں کہ ایک سکھ نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم دو بھائی تھے۔ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے ہمارے والد صاحب سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ ان کے پاس آپ جاتے آتے رہتے ہیں انہیں سمجھائیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ جب مَیں مرزا غلام احمد صاحب کے پاس گیا اور ان کو کہا کہ آپ کے والد

صاحب کو اس خیال سے بہت دکھ ہوتا ہے کہ ان کا چھوٹا لڑکا اپنے بڑے بھائی کی روٹیوں پر پلے گا، (کوئی کام نہیں کرتا)۔ اسے کہو کہ میری زندگی میں کوئی کام کر لے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ اچھی نوکری مل جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے والد صاحب نے کہا کہ مَیں اگر مر گیا تو پھر سارے ذرائع بند ہو جائیں گے۔ حضرت مصلح موعود کہتے ہیں کہ اس سکھ نے بتایا کہ جب ہم حضرت مرزا غلام احمد صاحب کے پاس گئے اور آپ کے والد صاحب کے خیال کا اظہار آپ کے سامنے کیا کہ آپ کی حالت دیکھ کے انہیں بہت دکھ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب نے کہا کہ اگر میں مر گیا تو غلام احمد کا کیا بنے گا؟ تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کہا کہ آپ اپنے والد کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟ اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے والد کپورتھلہ کی ریاست میں کوشش کر رہے تھے اور کپورتھلے کی ریاست نے آپ کو ریاست کا افسر تعلیم مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ افسر تعلیم مقرر کرنے کی ایک آفر بھی آ گئی تھی۔ وہ سکھ کہنے لگے کہ جب ہم نے یہ بات کہی کہ آپ اپنے والد صاحب کی بات کیوں نہیں مانتے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرے والد صاحب تو یونہی غم کرتے رہتے ہیں، انہیں میرے مستقبل کی کیوں فکر ہے۔ مَیں نے تو جس کی نوکری کرنی تھی کر لی ہے۔ کہتے ہیں ہم واپس آ گئے اور مرزا غلام مرتضیٰ صاحب سے آ کر یہ ساری بات کہہ دی۔ مرزا صاحب نے کہا کہ اگر اس نے یہ بات کہی ہے تو ٹھیک کہا ہے کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ابتدا تھی اور پھر ابھی انتہا نہیں ہوئی لیکن جو عارضی انتہا نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ہزاروں ہزار آدمی آپ پر قربان ہونے والا موجود تھا اور پھر اس شعر کا ذکر کیا جو پہلے بھی میں نے پڑھا ہے کہ

لُفَاظَاتُ الْمَوَائِدِ كَانَ اُكُلِيْ

وَصِرْتُ الْيَوْمَ مِطْعَامَ الْاَهَالِيْ

کہ ایک ایسا زمانہ تھا جب بچے ہوئے ٹکڑے مجھے ملا کرتے تھے اور آج میرا یہ حال ہے کہ میں سینکڑوں خاندانوں کو پال رہا ہوں۔ حضرت مصلح موعودؓ کہتے ہیں کہ آپ کی ابتدا کتنی چھوٹی تھی مگر آپ کی انتہا ایسی ہوئی کہ علاوہ ان لوگوں کے جو خدمت کرتے تھے لنگر میں روزانہ دو اڑھائی سو آدمی کھانا کھاتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اپنے والد کی جائداد میں اپنے بھائی کے برابر کے شریک تھے لیکن زمینداروں میں یہ عام دستور ہے، اس زمانے میں یہ زیادہ تھا کہ جو کام کرے وہ تو جائیداد میں شریک سمجھا جاتا تھا اور جو کام نہیں کرتا وہ جائداد میں شریک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لوگ عموماً کہہ دیتے ہیں کہ جو کام نہیں کرتا اس کا جائداد میں کیا حصہ ہوسکتا ہے۔ شروع زمانے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پاس جب کوئی ملاقاتی آتا اور اپنی بھاوجہ کو کھانے کے لئے کہلا بھیجتے تو وہ آگے سے کہہ دیتیں کہ وہ یونہی کھا پی رہا ہے۔ کام کاج تو کوئی کرتا نہیں۔ اس پر آپ اپنا کھانا اس مہمان کو کھلا دیتے اور خود فاقہ کر لیتے یا تھوڑے سے چنے چبا کر گزارا کر لیتے۔ حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں کہ خدا کی قدرت ہے وہی بھاوجہ جو اس وقت آپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی بعد میں میرے ہاتھ پر احمدیت میں داخل ہوئیں۔ غرض اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی کام شروع کیا جاتا ہے تو اس کی ابتدا بڑی نظر نہیں آیا کرتی لیکن اس کی انتہا پر دنیا حیران ہو جاتی ہے۔'' (ماخوذ از تفسیر کبیر جلد 7 صفحہ 102-101)

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قادیان ہی نہیں بلکہ قادیان سے باہر بھی دنیا کے کئی ممالک میں آپ کا لنگر چل رہا ہے۔ اُس وقت تو شاید دو تین تنوروں پر روٹی پکتی ہو اور لنگر چل رہا تھا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے لنگروں میں روٹی کے پلانٹ لگے ہوئے ہیں۔ قادیان میں بھی، ربوہ میں اور یہاں لنگر میں بھی لاکھوں روٹیاں ایک وقت میں پکتی ہیں۔ اللہ کے فضل سے یہاں جلسہ پر جو انتظامات ہیں ان میں بڑا وسیع لنگر کا انتظام ہے۔ جیسا کہ مَیں پہلے پچھلے جمعہ ذکر کر چکا ہوں، اس دفعہ بہت سارے جرنلسٹ بھی آئے ہوئے تھے۔ اخباری نمائندے آئے ہوئے تھے۔ وہ لنگر کے انتظام کو دیکھ کے، کھانا پکتے دیکھ کے، روٹی پلانٹ کو

دیکھ کے بڑے متاثر ہوئے ہیں۔ مشین کی روٹی ساروں کو پسند آئی۔ ایک جرنلسٹ جو دیکھ رہے تھے انہوں نے وہاں کھڑے کھانے کی خواہش کی۔ انہیں روٹی دی گئی تو ان کو بڑی پسند آئی اور کھا گئے۔ پھر انہوں نے کہا اور کھا سکتا ہوں؟ تو احمدی نے جو اُن کے ساتھ تھے کہا کہ بیشک کھائیں، جتنی مرضی کھائیں کیونکہ یہ مسیح کا لنگر ہے یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔

پس کیا وہ زمانہ تھا کہ ایک مہمان آتا تھا تو آپ اپنا کھانا اسے دے دیتے تھے اور خود فاقہ کرتے تھے اور کہاں آج کہ دنیا کے مختلف ممالک میں ہزاروں لوگ آپ کے دستر خوان سے کھانا کھا رہے ہیں اور یہ بھی انتہا نہیں ہے۔ ابھی تو ان لنگروں نے دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلنا ہے۔ انشاء اللہ۔ لاکھوں لوگوں نے، کروڑوں لوگوں نے آپ کے دستر خوان سے کھانا کھانا ہے۔ اسی طرح لاکھوں اور کروڑوں نے آپ کو ماننے کے بعد تقویٰ میں بھی بڑھنا ہے۔

آج ہمیں دنیا کمانے والے احمدیوں میں قربانی کے جو معیار نظر آتے ہیں یہ بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ اضافہ ہوتا چلا جانا ہے۔ پس اگر کوئی غور کرنے والا ایک لنگر کے نظام کو ہی دیکھ لے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ابتدائی حالات کو، زمانے کو سامنے رکھے تو یہی آپ کی صداقت کا ایک نشان بن جاتا ہے۔ بہت بڑا نشان ہے اور ہمارے ایمانوں میں تو یقیناً یہ اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر اس سارے نظام کو چلانے کے لئے مالی قربانی کی روح افراد جماعت میں پیدا ہوئی ہے تو یہ بھی اسی تقویٰ کا نتیجہ ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جُڑ کر ہم میں پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو حقیقی تقویٰ پیدا کرنے کی طرف مزید توجہ پیدا کرنے کی توفیق دے۔

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سیرت کے مختلف پہلوؤں اور بعض واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں، ان کو بیان کرتے ہیں اور جس طرح بیان کرتے ہیں اور بعض دفعہ آپ جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ بھی آپ کا ایک خاصّہ ہے۔ ایک عام آدمی کسی واقعے کی ظاہری حالت سے لطف تو اٹھا

سکتا ہے اور لطف اٹھا کر گزر جاتا ہے لیکن حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ اس میں سے جس طرح بڑے باریک نکات نکالتے ہیں وہ بھی ہمارے ایمان میں زیادتی کا باعث بنتا ہے اور معرفت میں ترقی ہوتی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کھانے کے انداز اور ڈھنگ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کھانے کا ڈھنگ بالکل نرالا تھا۔ میں نے کسی اور کو اس طرح کھاتے نہیں دیکھا۔ آپ پھلکے سے پہلے ایک ٹکڑا علیحدہ کرتے (یعنی باریک روٹی، چپاتی جو ہوتی ہے)۔ پھر لقمہ بنانے سے پہلے آپ انگلیوں سے اس کے ریزے بناتے جاتے اور منہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے جاتے اور پھر ان میں سے ایک چھوٹا سا ریزہ لے کر سالن سے چُھو کر منہ میں ڈالتے۔ یہ آپ کی عادت ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ دیکھنے والے تعجب کرتے اور بعض لوگ تو خیال کرتے کہ شاید آپ روٹی میں سے حلال ذرّے تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن دراصل اس کی وجہ یہی جذبہ ہوتا تھا کہ ہم کھانا کھا رہے ہیں اور خدا کا دین مصائب سے تڑپ رہا ہے۔ ہر لقمہ آپ کے گلے میں پھنستا تھا اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر آپ گویا اللہ تعالیٰ کے حضور معذرت کرتے تھے کہ تو نے یہ چیز (یعنی کھانا کھانا) ہمارے ساتھ لگا دی ہے (اور خوراک انسان کی ضرورت ہے)۔ ورنہ دین کی مصیبت کے وقت ہمارے لئے یہ ہرگز جائز نہ تھا۔ حضرت مصلح موعود کہتے ہیں وہ غذا بھی (جو آپ کی تھی) ایک مجاہدہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایک لڑائی ہوتی تھی ان لطیف اور نفیس جذبات کے درمیان جو اسلام اور دین کی تائید کے لئے اٹھ رہے ہوتے تھے اور ان مطالبات کے درمیان جو خدا تعالیٰ کی طرف سے قانون قدرت کے پورا کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے۔''

(ماخوذ از خطبات محمود جلد 17 صفحہ 270-269)

یعنی جو جذبات دین کی تائید کے لئے آپ کے دل میں تھے ان کے درمیان اور جو انسانی ضروریات ہیں، کھانا کھانا انسان کی ضرورت ہے، پینا انسان کی ضرورت ہے، ان کے درمیان ایک لڑائی چل رہی

ہوتی تھی۔آپ کا کھانا کھانا بھی ایک مجبوری تھی۔اصل فکر آپ کو دین کی تائید کی تھی، اسلام کی ترقی کی تھی۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا نمونہ ہمیں اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جب استعمال کریں تو اس کا شکر کریں۔ایک تو اس کی تسبیح کریں تو ساتھ ہی دین کی حالت کے درد کو بھی محسوس کریں۔اس کے لئے کوشش کریں کہ کس طرح ہم نے اشاعت دین اور تبلیغ دین میں حصہ ڈالنا ہے۔پھر کھانے کے اس انداز سے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا تھا تسبیح کے مضمون کی مزید وضاحت فرمائی اور قرآن کریم کے اس حصہ آیت سے کہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (التغابن:2) زمین و آسمان کی ہر چیز خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔حضرت مصلح موعودؓ نے یہ نکتہ نکالا ہے۔فرماتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جب کھانا کھایا کرتے تھے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ بمشکل ایک پھلکا آپ کھاتے تھے اور جب اٹھتے تو روٹی کے ٹکڑوں کا بہت سا چورا آپ کے سامنے سے نکلتا۔آپ کی عادت تھی جس طرح پہلے بتایا کہ روٹی کے ٹکڑے کرتے جاتے پھر کوئی ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے اور باقی ٹکڑے دسترخوان پر رکھے رہتے۔فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایسا کیوں کرتے تھے مگر کئی دوست کہا کرتے تھے کہ حضرت صاحب یہ تلاش کرتے ہیں کہ ان روٹی کے ٹکڑوں میں سے کون سا تسبیح کرنے والا ہے اور کون سا نہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس قسم کی بات سنی مجھے اس وقت یاد نہیں مگر یہ یاد ہے کہ لوگ یہی کہا کرتے تھے۔پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کہ زمین و آسمان میں سے تسبیحوں کی آواز اٹھ رہی ہے۔اب کیوں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے جبکہ ہم اس تسبیح کی آواز کو سن ہی نہیں سکتے۔اور جس چیز کو ہم سن نہیں سکتے اس کے بتانے کی ہمیں ضرورت کوئی نہیں تھی کہ کر رہی ہے۔جس کو ہم سن نہیں سکتے تو ہمیں کیا پتا۔اس لئے اللہ تعالیٰ کے بتانے کا مقصد کیا تھا۔کیا قرآن کریم میں کہیں یہ لکھا ہے کہ جنت میں فلاں شخص مثلاً عبدالرشید نامی دس ہزار سال سے بیٹھا ہوا ہے۔چونکہ ہمارے لئے اس کے ذکر سے کوئی

فائدہ نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسی باتیں نہیں بتائیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ کہ زمین و آسمان کی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے تو اس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ اے لوگو تم اس تسبیح کو سنو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ چاند نکل آیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ لوگ آئیں اور دیکھیں یا جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص گا رہا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ چلو اور اس کا راگ سنو۔ اسی طرح جب خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ کہ زمین و آسمان کی ہر چیز تسبیح کر رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس تسبیح کو سنو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ تسبیح ایسی ہے جسے ہم سن بھی سکتے ہیں۔ ایک سننا تو ادنیٰ درجے کا ہے اور ایک اعلیٰ درجے کا۔ مگر اعلیٰ درجے کا سننا انہی لوگوں کو میسر آ سکتا ہے جن کے ویسے ہی کان اور آنکھیں ہوں۔ اسی لئے مومن کو یہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کھانا شروع کرے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہے۔ کھانا ختم کرے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہے۔ کپڑا پہنے یا کوئی اور نظارہ دیکھے تو اسی کے مطابق تسبیح کرے۔ گویا مومن کا تسبیح کرنا کیا ہے؟ وہ ان چیزوں کی تسبیح کی تصدیق کرنا ہے۔ وہ کپڑے کی تسبیح اور کھانے کی تسبیح اور دوسری چیزوں کی تسبیح کی تصدیق کرتا ہے۔ جب انسان کھانا کھاتے ہوئے بِسْمِ اللّٰہ پڑھتا ہے۔ کھانا ختم کر کے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ پڑھتا ہے۔ کپڑا پہنتے ہوئے دعا کرتا ہے اور اللہ کو یاد رکھتا ہے تو یہ چیزیں جو انسان خود کر رہا ہوتا ہے یہی اصل میں تسبیح ہے جو ان چیزوں کی طرف سے ہو رہی ہوتی ہے۔ ان کو دیکھ کے جب انسان شکر گزاری کرتا ہے تو یہی تسبیح ان چیزوں کی طرف سے بھی ہو رہی ہے۔ حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں اَور کتنے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ رات دن کھاتے اور پیتے ہیں۔ پہاڑوں پر سے گزرتے ہیں، دریاؤں کو دیکھتے ہیں، سبزہ زاروں کا مشاہدہ کرتے ہیں، درختوں اور کھیتوں کو لہلہاتے ہوئے دیکھتے ہیں، پرندوں کو چہچہاتے ہوئے سنتے ہیں، مگر ان کے دلوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ کیا ان کے دلوں میں بھی ان چیزوں کے مقابلے میں تسبیح پیدا ہوتی ہے۔ اگر نہیں پیدا ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کی تسبیح کو نہیں سنا۔ مگر تم کہو گے کہ ہمارے کانوں میں تسبیح کی آواز

نہیں آتی۔ میں اس کے لئے تمہیں بتاتا ہوں کہ کئی آوازیں کان سے نہیں بلکہ اندر سے آتی ہیں۔

(ماخوذ از خطبات محمود جلد 16 صفحہ 150-149)

پس ہر شکر گزاری جو ہے جب وہ انسان کسی چیز کی کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھتا ہے تو سبحان اللہ پڑھتا ہے تو انسان کی جو تسبیح ہے وہ اصل میں ان چیزوں کی جو تسبیح ہے اس کا اظہار انسان کے منہ سے ہو رہا ہوتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پس تسبیح کے اس انداز کو بھی ہمیں اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے بلکہ تقویٰ تو یہی ہے کہ اس قسم کی تسبیح ہمارا معمول بن جائے۔

اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اسلام پر حملہ کرنے والوں کے منہ بند کرنے کے لئے اور اسلام کی خوبصورتی ظاہر کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اس تعلق میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں کہ:

ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عیسائی آیا اور اس نے کہا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی زبان اُمّ الالسنۃ ہے حالانکہ میکس مولر (Max Muller) وغیرہ نے لکھا ہے کہ جو زبان اُمّ الالسنۃ ہوتی ہے وہ مختصر ہوتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ ہم تو میکس مولر کے اس فارمولے کو نہیں مانتے کہ ام الالسنۃ مختصر ہوتی ہے مگر چلو بحث کو چھوٹا کرنے کے لئے ہم اس فارمولے کو مان لیتے ہیں۔ (بحث ختم کرنے کے لئے ہم اس فارمولے کو مان لیتے ہیں) اور عربی زبان کو دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اس شخص نے یہ بھی کہا تھا کہ انگریزی زبان عربی زبان کے مقابلے میں نہایت اعلیٰ ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن آپ نے فرمایا اچھا آپ بتائیں کہ انگریزی میں ''میرے پانی'' کو کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا مائی واٹر (my water)۔ آپ نے فرمایا عربی میں تو صرف مَائِیْ کہنے سے ہی یہ مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ اب آپ بتائیں کہ مائی واٹر (my water) زیادہ مختصر ہے یا

مَائِیْ۔اب اگرچہ حضرت مسیح موعودعلیہ السلام انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے آپ کی زبان پر ایسے الفاظ جاری کردیئے کہ معترض آپ ہی پھنس گیا اور وہ سخت شرمندہ اور لاجواب ہو گیا اور کہنے لگا کہ پھر تو عربی زبان ہی مختصر ہوئی۔ یہی حال قرآن کریم کا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کو دشمنوں کے حملوں سے بچائے گا یعنی ہمیشہ ایسے لوگ پیدا کرتا رہے گا جو قرآن کریم کو پڑھنے والے ہوں گے۔ اس سے سچا عشق رکھتے ہوں گے اور اس کی تفسیر کرنے والے ہوں گے۔ وہ دشمنوں کو ان کے حملوں کا ایسا جواب دیں گے کہ ان کا منہ بند ہو جائے گا۔ دوسرے اس نے قرآن کریم کے اندر ایسا مادہ رکھ دیا ہے کہ معترض جو بھی اعتراض کریں اس کا جواب اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔

حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے بھی اپنے زمانے میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کھڑا کر دیا جنہوں نے اتنے لمبے عرصے تک دشمن کا مقابلہ کیا کہ آپ کی وفات پر دشمنوں نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ آپ نے اسلام کا دفاع ایسے شاندار رنگ میں کیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی مسلمان عالم نے اس طرح اسلام کا دفاع نہیں کیا۔ یہ وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (المائدۃ:68) کا ہی کرشمہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ تھا کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہر حال بچانا ہے۔ جب دشمن نے تلوار سے حملہ کیا تو اس نے اس کی تلوار کو کند کر دیا۔ (دشمن کی تلواریں ٹوٹ گئیں۔) اور جب اس نے تاریخ سے حملہ کیا تو خدا تعالیٰ نے ایسے مسلمان کھڑے کر دیئے جنہوں نے تاریخی کتب کی چھان بین کر کے دشمن کے اعتراضات کو ردّ کر دیا اور خود مخالفین کے بزرگوں کی کتابیں کھول کر بتایا کہ وہ جو اعتراضات اسلام پر کر رہے ہیں وہ ان کے اپنے مذہب پر بھی پڑتے ہیں۔ اور جو حصہ قرآن کریم اور احادیث سے تعلق رکھتا تھا اسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صاف کر دیا۔

(ماخوذ از الفضل 22 نومبر 1956ء صفحہ 2۔4 جلد 45/10 نمبر 274)

پس آج بھی جو لوگ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم کلام جو ہے اسی سے ہم ان کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس طرف ہمیں توجہ دینی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تائید میں خود ہی نشانات بھی دکھاتا ہے اور دلائل بھی بتاتا ہے۔ بعض لوگ جو علمی ذوق رکھتے ہیں ان کے سینے بھی مزید کھولتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کم علمی کے باوجود عالم بننے کے شوق میں غیر ضروری باتیں کر جاتے ہیں اور جن سے بعض دفعہ مشکلات پیدا ہوتی ہیں بلکہ مخالفین کو استہزاء کا موقع ملتا ہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مصلح موعودؓ فرماتے ہیں کہ لوگ نئے نئے مسائل مذہب میں داخل کر رہے ہیں اور انہیں یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں ایک دوست تھے وہ بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ بعد میں تو نہایت مخلص احمدی ہوئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ مسئلہ بیان کیا تھا (پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے) کہ عربی زبان جو ہے وہ اُمّ الالسنۃ ہے یعنی سب زبانیں اسی سے نکلی ہیں۔ تو یہ صاحب جو تھے انہوں نے اس مسئلے کو لے لیا اور اسی کام میں مشغول ہو گئے کہ ہم ہر لفظ کا عربی زبان سے نکلا ہوا ثابت کریں۔ (لیکن زیادہ علم نہیں تھا۔ عربی کی زیادہ شدھ بدھ نہیں تھی تو وہ اسی کوشش میں لگ گئے۔) حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تو لغت کے واقف تھے۔ صَرف ونحو کے واقف تھے۔ زبان کے واقف تھے۔ آپ جو مسئلہ نکالتے تھے علم کی بناء پر نکالتے تھے۔ جب آپ نے یہ کہا کہ سب کچھ قرآن کریم میں موجود ہے تو اس سے آپ کی یہ مراد تو نہیں تھی کہ قرآن کریم میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ بڑھئی کا کام کس طرح کیا جائے یا اس میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ کھیتی باڑی کے کیا اصول ہیں۔ سب کچھ سے مراد یہ تھا کہ تمام ضروریات دینیہ قرآن کریم میں موجود ہیں۔ لیکن ان صاحب نے خیال کر لیا کہ سب کچھ قرآن کریم میں موجود ہے۔ چنانچہ جب بہت زیادہ شور مچانے لگ گئے۔ ہر جگہ ہر طبقے میں بیٹھ کے یہ باتیں کرنے لگ گئے کہ سب کچھ قرآن کریم میں موجود ہے تو کسی سر پھرے نے یہ کہہ دیا کہ آلو اور مرچوں کا قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں۔ اب انہوں نے بھی اپنی

دلیل تو دینی تھی۔ کہنے لگے کہ اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَان۔ (اس کے معنی اصل میں تو موتی اور مونگے کے ہیں) اس کا مطلب آلو اور مرچیں ہی ہیں۔ پس (حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں کہ) ایک طرف تو اتنا اندھیر ہے کہ بعض کے نزدیک خدا تعالیٰ کے قول کی طرح فقہاء کا قول بھی نہیں بدلتا۔ (بعض لوگ فقہاء کے قول کو بہت ترجیح دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو ایک فیصلہ ہو گیا، کسی فقیہ نے فیصلہ کر دیا وہ آخری فیصلہ ہے اور اس کو بدلہ نہیں جا سکتا) اور دوسری طرف لوگ تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں اور اندھیر مچا دیتے ہیں۔

(ماخوذ از خطبات محمود جلد 33 صفحہ 310-309)

اس سے مجھے یاد آ گیا، فیصل آباد میں ایک دفعہ جب چوہتّر (1974ء) کے فسادات ہو رہے تھے تو ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد کی تشریح فرما رہے تھے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ احمدی کافر ہیں۔ اس سے انہوں نے یہ استدلال کر لیا۔ بہرحال حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ جو ہیں دونوں طرف افراط و تفریط کرتے ہیں۔ کوئی اصول اور قاعدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ اصل طریق وسطی ہے۔ انسان کو تغیر قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے لیکن تغیر پیدا کرنا خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ جب چاہتا ہے تغیر پیدا کرتا ہے اور جب وہ تغیر پیدا کرنا چاہتا ہے تو پھر دنیا اسے تغیر سے روک نہیں سکتی۔

پھر بعض لوگوں کی غلط سوچیں جو ہیں ان کے بارے میں بھی حضرت مصلح موعود نے بیان کیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص قادیان آیا۔ اس نے کہا کہ اگر مرزا صاحب کو کہا جاتا ہے کہ آپ ابراھیم ہیں، نوح ہیں، موسیٰ ہیں، عیسیٰ ہیں، محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) تو (وہ کہنے لگا کہ) مجھے بھی خدا تعالیٰ ہر وقت کہتا ہے کہ تُو محمد ہے۔ لوگ اسے سمجھانے لگے تو اس نے کہا کہ خدا تعالیٰ کی آواز مجھے آتی ہے۔ وہ خود مجھے کہتا ہے کہ تُو محمد ہے۔ تمہاری دلیلیں مجھ پر کیا اثر کر سکتی ہیں۔ (کوئی اثر نہیں ہوگا) جب لوگ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے تو انہوں نے خیال کیا کہ بہتر ہے کہ انہیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخواست کی کہ آپ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے ذکر کر کے وقت لے دیں۔ حضرت خلیفہ اولؓ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا۔ آپ نے فرمایا اچھا اس شخص کو بلا لو۔ چنانچہ وہ شخص حضور کی خدمت میں لایا گیا اور اس نے کہا کہ خدا تعالیٰ مجھے ہر وقت یہ کہتا ہے کہ تم محمد ہو۔ آپ نے فرمایا مجھے تو خدا تعالیٰ ہر وقت یہ نہیں کہتا کہ میں ابراہیم ہوں، میں موسیٰ ہوں، عیسیٰ ہوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا لیکن جب وہ مجھے کہتا ہے کہ تم عیسیٰ ہو تو عیسیٰ والی صفات مجھے دیتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ تم موسیٰ ہو تو موسیٰ والے نشانات مجھے دیتا ہے اور اگر آپ کو اللہ تعالیٰ ہر وقت محمد کہتا ہے تو کیا وہ آپ کو قرآن کریم کے معارف اور لطائف اور حقائق بھی دیتا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا دیتا تو کچھ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا دیکھو سچے اور جھوٹے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص سچے طور پر کسی کو مہمان بناتا ہے تو وہ اسے کھانے کو دیتا ہے لیکن اگر کوئی کسی سے مذاق کرتا ہے تو وہ یونہی اسے بلا کر اس کے سامنے کھانے کے خالی برتن رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے یہ پلاؤ ہے، یہ زردہ ہے۔ خدا تعالیٰ مذاق نہیں کرتا۔ شیطان مذاق کرتا ہے۔ اگر آپ کو محمد کہا جاتا ہے اور پھر قرآن کریم کے معارف اور لطائف اور حقائق نہیں دیئے جاتے تو ایسا کہنے والا شیطان ہے، خدا نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ اگر کچھ کہتا ہے تو اس کے مطابق چیز بھی انسان کے آگے رکھ دیتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ کے سامنے کوئی چیز نہیں رکھی جاتی تو آپ یقین کر لیں کہ آپ کو محمد کہنے والا خدا نہیں، شیطان ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تغیر خدا تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔

(ماخوذ از خطبات محمود جلد 33 صفحہ 311-310)

پس وہ لوگ جو بعض دفعہ بعض خوابوں کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے دعوے کرنے لگ جاتے ہیں وہ اصل میں شیطان کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ تو جب کسی کو کچھ دیتا ہے تو اس کی چمک بھی دکھاتا ہے۔ اپنی تائیدات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ نشانات ظاہر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

کی فعلی شہادت اس کے ساتھ کام کر رہی ہوتی ہے۔ یہی ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ دیکھا اور یہی آپ کی پیشگوئی دربارہ مصلح موعود جو تھی اسے خلیفۃ المسیح الثانی کے حق میں پورے ہوتے دیکھا اور یہی خلافت احمدیہ کے قیام کی جو خوشخبری آپ نے دی تھی اس میں اللہ تعالیٰ کی فعلی شہادت سے اس کو ہم نے پورا ہوتے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ہر احمدی کے ایمان و ایقان میں ترقی عطا فرمائے اور وہ ان باتوں کو سمجھنے والا ہو۔

نماز کے بعد مَیں ایک جنازہ بھی پڑھاؤں گا جو مکرمہ صاحبزادی امۃ الباری صاحبہ کا ہے۔ 31؍اگست اور یکم ستمبر 2015ء کی درمیان رات کو 87 سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مکرمہ امۃ الباری بیگم صاحبہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پوتی، حضرت مرزا شریف احمد صاحب کی بیٹی اور حضرت نواب محمد علی خان صاحب کی نواسی تھیں۔ اور سیدۃ امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ اور نواب عبداللہ خان صاحب کی بہو تھیں۔ ان کے میاں مکرم عباس احمد خان صاحب مرحوم تھے۔ اور وہ میری پھوپھی بھی تھیں۔ 17؍اکتوبر 1928ء کو قادیان میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ 29؍دسمبر 1944ء کو جب میاں عباس احمد خان صاحب کے ساتھ ان کا نکاح ہوا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے جمعہ کے دن جمعہ کا خطبہ شروع کرنے سے پہلے چند نکاحوں کا اعلان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ چند نکاحوں کا اعلان کرنا چاہتا ہوں اور میں یہ بات کئی دفعہ ظاہر کر چکا ہوں کہ کچھ عرصے تک میں ایسے لوگوں کے نکاح پڑھا سکوں گا جو یا تو میرے عزیز ہوں یا ان سے میرے تعلقات عزیزوں کی طرح ہوں مثلاً دین کے لئے وہ زندگی وقف کر چکے ہوں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کا نکاح اس صورت میں پڑھا سکوں گا جبکہ ایسے موقع پر وہ درخواستیں پیش کی جائیں گی جب ایسے عزیزوں کا نکاح ہو۔ بہرحال آپ نے فرمایا کہ آج میں عزیزم عباس احمد خان کے نکاح کا اعلان کرنا چاہتا ہوں جو میری چھوٹی بہن اور میاں عبداللہ خان صاحب کے لڑکے ہیں اور لڑکی عزیزم میاں شریف احمد صاحب کی ہے۔ گویا لڑکا میرا بھانجا ہے اور لڑکی میری بھتیجی ہے۔ پھر آپ نے

مختلف نصائح فرمائیں اور وقف زندگی کا ذکر کیا اور اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا نام لیا کہ اس وقت خاندان کے لڑکوں میں سے جو سب سے زیادہ اس وقف کے لئے پیش کر چکے ہیں ان کا نام لیا کہ آپ ہیں اور اَوروں کو بھی توجہ دلائی۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آج سے ساٹھ ستّر سال پہلے یہ الہام شائع فرمایا تھا کہ تَرٰی نَسْلاً بَعِیْدًا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس نشان کو ایسے رنگ میں پورا ہوتے دیکھ رہے ہیں کہ روز بروز نشان کی اہمیت اور عظمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بعض نشان اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جس وقت وہ شائع کئے جاتے ہیں تو بڑے ہوتے ہیں اور ان کی عظمت زیادہ ہوتی ہے مگر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اس نشان کی عظمت میں آہستہ آہستہ کمی ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن بعض نشان اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ابتدا میں چھوٹے ہوتے ہیں مگر زمانے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے انکی عظمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ جس وقت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ الہام ہوا کہ تَرٰی نَسْلاً بَعِیْدًا۔ اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صرف دو بیٹے تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کے ہاں کچھ اور بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئیں اور پھر خدا تعالیٰ نے ان کو وسیع کیا اور اب ان بیٹوں اور بیٹیوں کی نسلیں الہام الٰہی کے ماتحت شادیاں کر رہی ہیں اور تَرٰی نَسْلاً بَعِیْدًا کے نئے نئے ثبوت مہیا کر رہی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ دنیا میں نسلیں تو پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ کونسا نشان ہے نسلیں تو دنیا میں اکثر آدمیوں کی چلتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کتنے آدمیوں کی نسلیں ہیں جو ان کی طرف منسوب بھی ہوتی ہوں اور منسوب ہونے میں فخر محسوس کرتی ہوں۔ اکثر آدمیوں کی نسلیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہارے پردادا کا کیا نام تھا تو ان کو پتا نہیں ہوتا مگر تَرٰی نَسْلاً بَعِیْدًا کا الہام بتا رہا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل آپ کی طرف منسوب ہوتی چلی جائے گی اور لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل آپ کی پیشگوئیوں کے ماتحت آپ کی صداقت کا نشان

ہے۔ پس تَرٰی نَسْلًا بَعِیْدًا میں صرف یہی پیشگوئی نہیں کہ آپ کی نسل کثرت سے ہوگی بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عظمت شان کا بھی اس جگہ اس رنگ میں اس پیشگوئی میں ذکر ہے کہ آپ کا مرتبہ اتنا بلند اور آپ کی شان اتنی ارفع ہے۔ آپ کی نسل ایک منٹ کے لئے بھی آپ کی طرف منسوب نہ ہونا برداشت نہیں کرے گی اور آپ کی طرف منسوب ہونے میں ہی ان کی شان اور ان کی عظمت بڑھے گی۔ پس اس پیشگوئی میں خالی اس بات کا ذکر نہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اولاد کثرت سے ہوگی بلکہ یہ بھی ذکر ہے کہ روز بروز بڑھے گی اور وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقام اور اعلیٰ مرتبے تک جا پہنچے اور خواہ ان کو بادشاہت بھی حاصل ہو جائے پھر بھی وہ اپنے آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف منسوب کرنے میں ہی فخر محسوس کرے گی۔ پس تَرٰی نَسْلاً بَعِیْدًا کے یہی معنی ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تیری نسل تجھے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرے گی اور تیری نسل کبھی اپنے دادا کو بھلانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس الہام کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غموں کا ایک دن اور چار شادی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ بیشک آپ کی نسل میں سے بعض لوگ مریں گے بھی جیسا کہ خدا تعالیٰ کی سنّت ہے مگر آپ کی نسل کم نہیں ہوگی بلکہ بڑھتی چلی جائے گی۔ اگر ایک مرے گا تو چار پیدا ہوں گے اور جہاں ایک مرے گا اور چار پیدا ہوں گے لازمی بات ہے کہ وہ نسل بڑھتی چلی جائے گی۔

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اولاد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عظمت اور آپ کے درجے کی بلندی کا ہمیشہ نشان رہے گی اور ہمیشہ اپنے آپ کو آپ کی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرے گی اور جب وہ آپ کی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرے گی تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی ہیں کہ وہ اولاد اپنے دادا کی بڑائی اور عظمت کا اقرار کرتی ہے اور دنیا اس اقرار کی عظمت کو تسلیم کرتی ہے۔

(ماخوذ از خطبات محمود جلد 3 صفحہ 605 تا 608)

یہ تفصیلی ذکر مَیں نے اس لئے کر دیا کہ یہ بات خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے افراد پر بھی بہت بڑی ذمہ داری ڈالتی ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کو بھی سمجھیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی ہمیشہ ہر وقت سامنے رکھیں کہ 'ہماری طرف منسوب ہو کر پھر ہمیں بدنام نہ کرو'۔

(ماخوذ از ملفوظات جلد 7 صفحہ 188)

پس صرف نسل ہونا ہی بڑائی نہیں بلکہ آپ کی تعلیم پر عمل کرنا اور آپ کے ساتھ منسوب ہو کر آپ کی عزت و احترام اور جو مقام ہے اس کو قائم کرنا بھی سب کا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو اس کی بھی توفیق عطا فرمائے، ہمیں بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔

جب تقسیم ہند ہوئی ہے، پاکستان بنا ہے اس وقت آپ کو اسی بس میں سفر کرنے کا اعزاز ملا جس میں حضرت امّاں جان اور خاندان کی بعض دوسری خواتین سفر کر رہی تھیں اور پھر لاہور پہنچ کر ابتدائی دنوں میں رتن باغ میں ان کا قیام رہا جہاں حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قیام تھا۔ اس کے بعد بھی آپ ہمیشہ لاہور ہی رہیں۔ آپ کی بہت بڑی خصوصیت غریب پروری اور مہمان نوازی تھی اور بڑی بے تکلف طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کا گھر جو تھا اکثر مہمانوں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ کسی بھی قسم کا کوئی مہمان آ جائے چاہے وہ عزیز رشتے دار ہو، کوئی دوست ہو، غیر ہو، غریب ہو، بہترین طریقے سے اس کی مہمان نوازی کیا کرتی تھیں اور یہ ان میں بہت بڑا وصف تھا اور بڑی عزت و احترام سے پیش آیا کرتی تھیں۔ پھر اسی طرح آپ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ خاندان کے علاوہ بھی لوگوں سے، جماعت کے ہر فرد سے بڑے وسیع تعلقات تھے۔ جن جن سے ان کا واسطہ پڑا وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ پھر اسی طرح مالیر کوٹلہ کے جو غیر احمدی رشتے دار تھے ان سے بھی آپ نے ہمیشہ تعلق رکھا اور نبھایا۔ بعض تو عارضی مہمان آتے ہیں۔ پھر مستقل مہمان بھی، خاندان کے افراد بھی، نوجوان لڑکے لڑکیاں جب لاہور میں کالج میں، یونیورسٹیوں میں پڑھتے تھے اور اسی طرح بہت سارے دوسرے بھی میں نے دیکھا ہے آپ کے گھر رہتے تھے اور آپ کی مہمان نوازی

باقاعدہ ان کے لئے بھی بڑے کھلے دل کے ساتھ چلتی تھی۔ اور یہ نہیں کہ کوئی (خاص) وقت ہے جب بھی پہنچ جاؤ فوری طور پر مہمان نوازی کے لئے تیار ہوتی تھیں۔ اسی طرح حضرت مصلح موعود کی زندگی کے بہت سارے تاریخی واقعات بھی آپ کے علم میں تھے جو آپ اپنے عزیزوں کو سناتی تھیں اور یہ محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کشائش عطا فرمائی تو اس کو آپ نے ہمیشہ غریبوں کی خدمت میں، غریبوں کے لئے استعمال کیا۔ بہت سارے بچوں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کئے۔ شادیوں پہ بڑے کھلے دل سے دیا کرتی تھیں۔ اسی طرح اپنے میاں عباس احمد خان صاحب کی وفات کے بعد نظارت تعلیم کی وساطت سے ان کے نام پر ایک مستقل وظیفے کا اجراء آپ نے کیا۔ آپ گر گئی تھیں جس کی وجہ سے ٹانگ میں فریکچر تھا اور اس کی وجہ سے دو تین آپریشن بھی ہوئے۔ کچھ عرصے سے بڑی تکلیف میں تھیں۔ لیکن بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کرتی رہیں۔ اور آخر 31/اگست کو اور یکم ستمبر کی درمیانی رات دل کا دورہ پڑا اور اپنے خالق حقیقی کے حضور حاضر ہوگئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

چندوں میں بہترین معیاری چندے دینے والی تھیں۔ اپنا حصہ جائداد، حصہ آمد، حصہ وصیت وغیرہ سارا کچھ اپنی زندگی میں ادا کیا۔ 1958ء سے لے کر 94ء تک ضلع لاہور میں لجنہ کی مختلف حیثیتوں میں آپ کارکن رہیں، سیکرٹری رہیں، خدمت کرتی رہیں۔ ایک زمانے میں لجنہ لاہور کی جنرل سیکرٹری بھی رہی ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے غریبوں سے بڑی ہمدردی کرنے والی، ان کا خیال رکھنے والی تھیں۔ اور جس طرح مَیں نے ان کو ہر ایک کے خوشی، غم میں اپنا سمجھ کر شریک ہوتے ہوئے دیکھا ہے چاہے وہ غیر ہو، اپنا ہو، کسی اَور کو نہیں دیکھا۔ پھر اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی جو ان کو پسند آئی یا ان کی کسی طرح کسی رنگ میں بھی خدمت کی ہے تو اس کو اجر دیتی تھیں۔ منیر حافظ آبادی صاحب قادیان کے ہیں، لکھتے ہیں کہ یہ 1989ء کے جوبلی جلسے میں قادیان آئی تھیں تو منیر حافظ آبادی صاحب کو کچھ خدمت کا موقع ملا تو انہیں بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پگڑی کے کپڑے کا تبرک دیا۔ اسی طرح اس دفعہ لوگوں نے، افراد جماعت

نے دیکھا ہوگا کہ عالمی بیعت کے وقت مَیں نے ایک مختلف رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ یہ سبز نہیں تھا ذرا دوسرے رنگ کا تھا۔ یہ کوٹ بھی مجھے انہوں نے بھجوایا تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوٹ تھا جو حضرت مرزا شریف احمد صاحب کے پاس تھا۔ پھر ان کے حصے میں آیا تو انہوں نے مجھے بھیج دیا کہ یہ میں تمہیں دیتی ہوں۔ پھر یہ ہے کہ خلافت سے تعلق انتہا کا تھا اور بڑا عزت اور احترام کا تعلق تھا۔ ہمیشہ مجھے فون کرتی تھیں۔ اس بات کی بڑی خواہش ظاہر کیا کرتی تھیں کہ بات ہو جائے۔ پھر ہمیشہ ان کو یہ فکر تھی کہ میری اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ نیکیوں کی توفیق دے اور آپس میں ایک ہو کے رہیں۔ اللہ کرے کہ ان کی اولاد ہمیشہ ان کی نیکیوں کو بھی جاری رکھنے والی ہو اور آپس میں بھی مل جل کر رہنے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور مغفرت کا سلوک فرمائے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ نماز کے بعد میں ان کا جنازہ غائب ادا کروں گا۔

○○